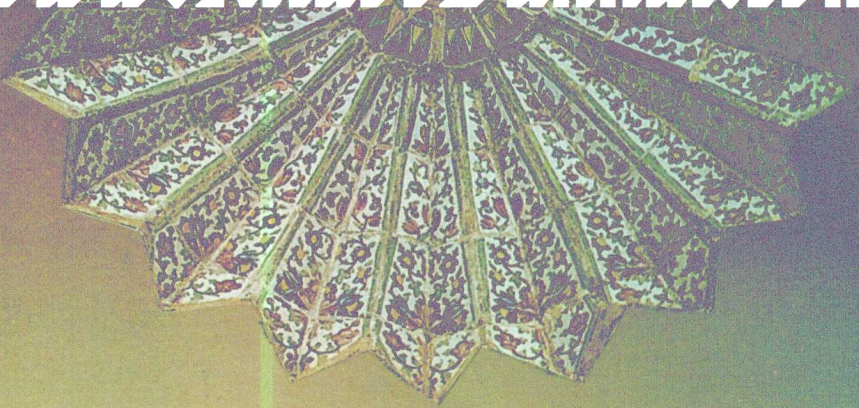


# دَعْوَتِ اِسْلَام

دَعْوَتِ اِوَرْتَعَارِ فِی مَضَامِیْن

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)



مولانا وحید الدین خاں



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ  
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی اربنہ  
محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

### تنبیہ

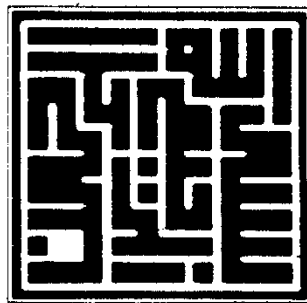
ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے  
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی  
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے  
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ [KitaboSunnat@gmail.com](mailto:KitaboSunnat@gmail.com)

🌐 [www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)



www.KitaboSunnat.com

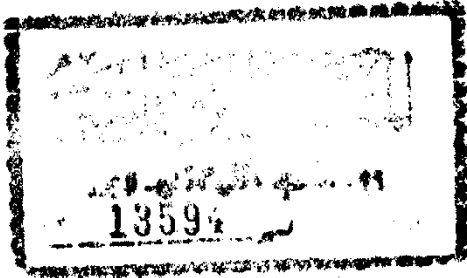
# دعوتِ اسلام

## دعوتی اور تعارفی مضامین

مولانا وحید الدین خاں

www.KitaboSunnat.com

13594  
(13594)



جملہ حقوق محفوظ

○ ناشر: محمد احسن تہامی  
○ مطبع: اے این اے پرنٹرز — لاہور

○ تاریخ اشاعت:

○ قیمت: 00.00

دارالتذکرہ

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار،  
لاہور۔ ۵۳۰۰۰ فون: ۴۲۳۱۱۱۹

۶۶	پھر بھی انھیں الفاظ مل گئے	۳۶	پیغمبر کی پیشین گوئی	۸	آغازِ کلام
۶۷	جھوٹی مخالفت	۳۷	دعوت کا میدان	۹	<b>باب اول :</b>
۶۸	رسول کو ماننا	۳۸	عبادت گاہ	۱۰	پیغامِ دعوت
۶۹	دینِ فطرت	۳۹	نئے خون کی ضرورت	۱۱	امتِ مسلمہ کا مقصد
۷۰	دعوتی تسخیر	۴۰	سیاست، دعوت	۱۲	امتِ وسط
۷۱	حوصلہ مندی	۴۱	مسجد	۱۳	مختصباتِ اوقاف یا خیر خواہ اوقاف
۷۲	سابق شاہِ روس	۴۲	عمل، ردِ عمل	۱۴	شہادتِ غیر حق
۷۳	فرانس میں اسلام	۴۳	تعلیم، تحریک	۱۵	معجزہ کیا ہے
۷۴	جاپان میں اسلام	۴۴	قرآن کا ترجمہ	۱۶	سیاست نہیں آخرت
۷۵	فطرتِ انسانی	۴۵	داعیاءِ عمل، داعیاءِ روئے	۱۷	تاریخ کا ایک صفحہ
۷۶	فتحِ اسلام	۴۶	دلیل کی سطح پر	۱۸	قانونِ فطرت
۷۷	<b>باب چہارم :</b>	۴۷	چالیس سال بعد	۱۹	دعوتِ الی اللہ
۷۸	امکاناتِ دعوت	۴۸	دعوتی قوت	۲۰	ایک تشریح
۷۹	ابدی امکان	۴۹	ایک حدیث	۲۱	احیاءِ ملت
۸۰	عجیب فرق	۵۰	<b>باب سوم :</b>	۲۲	مدافعتِ زکریا جرحیت
۸۱	عظیم امکان	۵۱	واقعاتِ دعوت	۲۳	<b>باب دوم :</b>
۸۲	منصوبہٴ خداوندی	۵۲	تعارفِ اسلام	۲۴	عملِ دعوت
۸۳	امتیازی صفت	۵۳	پیغمبر کا طریقہ	۲۵	دعوتی عمل
۸۴	دعوتِ ہاٹ لائن	۵۴	اسلامی طریقہ	۲۶	تعمیری لاوا
۸۵	اشاعتِ اسلام	۵۵	جوہری فرق	۲۷	اسلام کی پیکار
۸۶	حقیقت کی تلاش	۵۶	دو قسم کے انسان	۲۸	دو آیتیں
۸۷	دعوتی امکان	۵۷	بدگانی	۲۹	دعوتِ الی اللہ
۸۸	فکری طاقت	۵۸	جھوٹا یقین	۳۰	داعی کا معاملہ
۸۹		۵۹		۳۱	
۹۰		۶۰		۳۲	
۹۱		۶۱		۳۳	
۹۲		۶۲		۳۴	
۹۳		۶۳		۳۵	

۱۹۳	مدعو نہ کر حریف	۱۵۸	قانونِ فطرت	۱۱۲	شاہِ کلید
۱۹۵	دعوتی تدبیر	۱۵۹	بددعا نہیں	۱۱۵	حق کی طاقت
۱۹۶	ایک اقتباس	۱۶۰	داعی کا طریقہ	۱۱۸	تاریخ کا اشارہ
		۱۶۱	ایک سنت	۱۱۹	فطرت کی آواز
		۱۶۲	غصہ نہ کرو	۱۲۰	ایک امکان
		۱۶۳	بددعا نہیں	۱۲۳	حق کی تلاش میں
		۱۶۵	بصیرت کی اہمیت	۱۲۴	ایک لطیفہ
		۱۶۶	یہ فرق کیوں	۱۲۵	نظریاتی خلا
		۱۶۷	دو منٹ کی بات	۱۲۸	وسط ایشیا
		۱۶۸	ناقابلِ معافی	۱۳۱	دروازہ کھلتا ہے
		۱۷۰	ردِ عمل	۱۳۱	اسلام کی طاقت
		۱۷۲	کئی یہاں ہے	۱۳۲	نئے امکانات
		۱۷۳	نفرت، محبت	۱۳۶	جاپان میں دعوت
		۱۷۶	تشخص کا مسئلہ	۱۳۸	ایک امکان
		۱۷۷	اسلوبِ دعوت کا مسئلہ	۱۳۹	دنیا منتظر ہے
		۱۷۹	جنگ بے فائدہ	۱۵۰	صفوہِ عبرت
		۱۸۱	بے ترتیب نماز	۱۵۱	نیادور
		۱۸۴	داعی کا مقام	۱۵۲	ایک تقابلی
		۱۸۷	منافع کے ساتھ برتاؤ		<b>باب پنجم :</b>
		۱۸۹	صبر اور دعوت	۱۵۳	آدابِ دعوت
		۱۹۰	داعی اور مدعو	۱۵۴	مقصدی کردار
		۱۹۱	دعوتی مشن	۱۵۶	دعوت الی اللہ
		۱۹۲	دعوت یا نفرت	۱۵۷	داعی اور مدعو

## اعجازِ کلام

مسلمان ختمِ نبوت کے بعد مہتممِ نبوت پر ہیں، مسلمانوں کو پیغمبر کی نیابت میں وہی کام انجام دینا ہے جو پیغمبر نے اپنی زندگی میں براہِ راست انجام دیا۔

اللہ کی نصرت کے تمام وعدے عملِ دعوت کی انجام دہی پر موقوف ہیں۔ اسی میں ملتِ اسلام کی دنیا اور آخرت کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے حتیٰ کہ امتِ محمدی کا امتِ محمدی ہونا بھی اس پر موقوف ہے کہ وہ اس عملِ دعوت کو انجام دے۔

اس کام کی صحیح ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اندر دعوتی شعور بیدار کیا جائے انھیں بتایا جائے کہ مسلمان اور دیگر اقوام کے درمیان جو تعلق ہے وہ داعی اور مدعو کا تعلق ہے نہ کہ ایک قوم اور دوسری قوم کا۔

اس مسئلہ کے مختلف پہلو ہیں ان پہلوؤں کو زیرِ نظر کتاب میں حسبِ ذیل ابواب کے تحت واضح کیا گیا ہے — پیغامِ دعوت، عملِ دعوت، واقعاتِ دعوت، امکاناتِ دعوت، آدابِ دعوت۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں میں جذبہٴ دعوت پیدا کرنے کا ذریعہ بنے تاکہ ایک طرف مسلمان اپنی دعوتی ذمہ داری کو پورا کر کے اللہ کے نزدیک سبکدوش ہو سکے اور دوسری طرف اس عملِ دعوت کے نتیجہ میں اقوامِ عالم پر خدا کی رحمت کے وہ دروازے کھل جائیں جو موجودہ زمانہ میں ابھی تک بند پڑے ہوئے ہیں۔

وحید الدین خان

۳۱ اکتوبر ۱۹۹۶ء



باب اول :

# پیغام دعوت

## امت مسلمہ کا مقصد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لئے آئے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلائیں۔ آپ کے بعد بھی آپ کے پیروؤں کا مشن بھی ہے (قل ھذا کہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ذمنا البغی، یوسف ۱۰۸) قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نظر میں سب سے زیادہ اہم معاملہ آخرت کا معاملہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ موت سے پہلے آدمی اس حقیقت سے باخبر ہو جائے کہ اگر وہ اللہ والا بن کر نہیں مرے تو اس کے لئے خطرہ ہے کہ وہ ابدی بربادی کے جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد جب اگلی دنیا بتائی جائے گی تو سارے لوگوں کا مقدمہ خدا کے یہاں پیش ہو گا۔ اس وقت لوگوں کے مستقل انجام کا فیصلہ کرنے کے لئے جو طریق عمل اختیار کیا جائے گا وہ یہ ہو گا کہ وہ داعیان حق وہاں گواہ بنا کر کھڑے کئے جائیں گے جنہوں نے دنیا کی زندگی میں ان کو خود تک اللہ کے دین کو پیچھا پھا۔ پچھلے زمانوں کے لئے اس زمانہ کے انبیاء گواہ بنیں گے۔ بعد کے زمانے میں جب کہ نبوت ختم ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر دین کی مکمل گواہی دے دی اور اس کے بعد اس امت کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ یہ قیامت تک دنیا کی قوموں کے اوپر داعی بن کر کھڑی ہوتی رہے تاکہ آخرت کے دن وہ قوموں کے مقدمے میں اللہ کی گواہ بن سکے۔ پیغمبر جس طرح ہمارے اور خدا کے درمیان واسطہ ہے اسی طرح یہ امت پیغمبر اور قوموں کے بیچ میں کھڑی ہوئی ہے اور پیغمبر کی طرف سے بالواسطہ طور پر تمام قوموں تک دعوت پہنچانے کے لئے مامور ہے :

و کذ لک جعلناک امۃ وسطا لکنوا شہدا ء۱ اور اس طرح ہم نے بنا دیا تم کو بیچ کی امت تاکہ تم گواہ ہو علی الناس دیکون الرسول علیکم شہیدا (بقرہ ۱۴۳) لوگوں پر اور رسول ہو گواہ تمہارے اوپر

دوسری قوموں کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اللہ کے دین کو اپناتی ہیں یا نہیں۔ اسی طرح امت مسلمہ کا مستقبل تمام تر اس سوال پر معلق ہے کہ وہ اللہ کے دین کی گواہ بننے کے لئے اٹھتی ہے یا نہیں۔ جس طرح دوسری قوموں کی نجات کسی اور دین کو اختیار کر کے نہیں ہو سکتی، اسی طرح امت مسلمہ کی نجات کسی اور میدان میں عمل کر کے نہیں ہو سکتی، تاہوا اس میں وہ کہتے ہی بڑے بڑے کارنامے دکھا رہی جو۔ حتیٰ کہ صرف نماز روزہ بھی اس کی نجات کے لئے کافی نہیں ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کو جب چھیل نے گل لیا تو یہ ”نماز روزہ“ میں کوتاہی کی بنا پر نہ تھا۔ ان چیزوں میں ابغناہ نے بھی کوئی کمی نہیں کی تھی۔ ان کی کمی صرف یہ تھی کہ اپنی مدعو قوم پر دعوت کا حق ادا کرنے میں اجتہاد بنا دیا۔ پھر ان کی طرف سے کوتاہی واقع ہو گئی۔ اتنی بات بھی اللہ کو پسند نہیں آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ کی کامیابی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تمام تر اس پر منحصر ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کے لئے اٹھے اور اس کے تمام تقاضوں کے ساتھ اس کو انجام دے۔ بصورت دیگر اس کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ امت مسلمہ کے ساتھ اللہ کے تمام وعدے اسی قیمت پر ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ اللہ کے یہاں بے قیمت ہو جائے گی، خواہ کسی اور میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دے رہی ہو۔

## امت وسط

قرآن میں امت محمدی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اور اس طرح ہم نے تم کو امت وسط بنا دیا تاکہ تم لوگوں کے اوپر گواہ بنو اور رسول تمہارے اوپر گواہ ہو (البقرہ ۱۴۳)

وسط کے معنی بیچ کے ہیں۔ یعنی وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان ہو (وسط الشیء مابین طرفین) مثلاً عربی میں کہا جاتا ہے کہ قبضت وسط الحبل میں نے رسی کے بیچ میں پکڑا، یا جلست وسط القوم (میں لوگوں کے درمیان میں بیٹھا) اموی حاکم حجاج بن یوسف نے کوفہ اور بصرہ کے بیچ میں ایک شہر بسایا تھا۔ اسی لیے اس کو واسط کہا جاتا تھا۔ کیوں کہ وہ ایک ایسا مقام تھا جو بصرہ اور کوفہ کے درمیان واقع تھا (سموہ واسط لاند مکان وسط بین البصرہ والنکوفہ) سان المرۃ - ۲۶ - ۲۷

الطبری نے نقل کیا ہے کہ وسط سے مراد وہ چیز ہے جو دو کناروں کے بیچ میں ہو (السدی ہو بین الطرفین) ابن زید نے کہا کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ امت محمدی بنی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسری قوموں کے درمیان ہے (ہم وسط بین النبی صلی اللہ علیہ وسلم و بین الامم) میرزا - ۲۷ - ۲۸

یہ آیت کوئی فضیلت یا اعزاز کی آیت نہیں ہے۔ وہ امت مسلمہ کی دعوتی ذمہ داری کو بتاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد یہ امت رسول اور ہم اپنی ہم عصر قوموں کے درمیان ہے۔ اس کو رسول سے لے کر دوسری قوموں تک پہنچانا ہے۔ دعوتی عمل میں اس کو درمیانی ذریعہ کا کردار ادا کرنا ہے۔

یہ ایک بے حدنازک کام ہے۔ کیوں کہ یہ گویا اہل عالم کے سامنے خدا کے رسول کی نمائندگی ہے۔ ایک طرف امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ پہنچانے کا یہ کام نھرو کرے۔ اگر اس نے نہیں پہنچایا تو یہ اس کے حق میں ایک ناقابل معافی کوتاہی ہوگی۔ دوسری طرف اس کام میں انتہائی احتیاط برتنا ہے۔ یعنی دوسروں تک عین وہی بات پہنچانا ہے جو رسول کی بات ہے، اس میں کسی بھی قسم کا انحراف اس کے لیے جائز نہیں۔

امت محمدی کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کو دین دار بنائے۔ اس کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ درمیانی کردار ادا کرتے ہوئے دوسروں کو دین کی دعوت دے۔

## محتسبِ اقوام یا خیر خواہِ اقوام

ایک مسلم رہنمانے لکھا ہے کہ مسلمان اپنے عقیدہ کی رو سے محتسبِ اقوام ہیں۔ ایک اور رہنما نے لکھا ہے کہ مسلمان تمام قوموں کے اوپر خدائی فوجدار ہیں۔ تقریباً ایک صدی سے یہی بات ایک یا دوسرے لفظ میں کہی جا رہی ہے۔ شاعر اور خطیب اور انشاپرداز قسم کے لیڈر اس بات کو نہایت جذباتی انداز میں بیان کرتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اب موجودہ مسلم نسل کا یہی عام ذہن بن گیا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کا فوجانہ طبقہ ہر جگہ اسی احساسِ مالکیت سے سرشار نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ خاص نفسیات ہے جس کے تحت مسلم فوجانہ ساری دنیا میں ان سرگرمیوں میں مشغول ہیں جن کو وہ بطور خود انفتلابی سرگرمی کہتے ہیں اور دوسرے لوگوں نے جس کو توڑ پھوڑ اور دہشت گردی کا نام دیا ہے۔

مگر مسلمان کی شخصیت کے بارے میں یہ حاکمانہ نظریہ سراسر لغو ہے۔ اس کا قرآن و حدیث سے کوئی تعلق نہیں۔ مسلمان کی حیثیت اس دنیا میں محتسبِ اقوام کی نہیں ہے، بلکہ خیر خواہِ اقوام کی ہے۔ مسلمان کو دعوت کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ مسلمان دوسری قوموں کے سامنے خدا کے دین کا داعی ہے۔ داعیِ روحانی ڈاکٹر ہوتا ہے۔ جس طرح ایک سچا ڈاکٹر خیر خواہی کی حد تک اپنے مریض کا خدمت گار ہوتا ہے۔ اسی طرح سچا داعی وہ ہے جو خیر خواہی کی حد تک لوگوں کی ہدایت کا حریص بن جائے۔

داعی کے لیے قرآن میں ناصح (خیر خواہ) اور امین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ داعی ایک وقت دو شدیدا احساس کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے دین کا امانت دار ہے۔ یہ احساس اس کے اندر آخری تک ذمہ داری کا جذبہ ابجا دیتا ہے۔ وہ اس ڈر سے کانپتا رہتا ہے کہ امانت کی ادائیگی میں اگر ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو وہ خدا کے یہاں پکڑا جائے گا۔ دوسری طرف بندوں کے ساتھ خیر خواہی کا احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہر تہی کو اپنی ذات پر بستے ہوئے مدعو کو خدا کی رحمتوں کے سایہ میں لانے کی کوشش کرے۔

اس طسرح جو انسان بنے وہ خیر خواہِ اقوام ہو گا نہ کہ محتسبِ اقوام۔ وہ لوگوں کی نجات کے لیے تڑپے گا نہ کہ لوگوں کے اوپر حاکمانہ اختیار استعمال کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے۔

## شہادت غیر حق

مولانا محمد علی جوہر (۱۹۳۱-۱۸۷۸) مشہور سیاسی لیڈر ہیں۔ وہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۰ء تک برصغیر ہند کی سیاست پر چھانے رہے۔ وہ ہندوستان کو انگریزوں کے سیاسی اقتدار سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کے بہت سے پرجوش واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

مولانا محمد علی کی آخر عمر میں لندن میں پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ہوئی۔ وہ سن درمی سفر کوکے وہاں پہنچے۔ ۳ جنوری ۱۹۳۱ء کو انہوں نے کانفرنس میں ایک ”محرکہ الآراء“ تقریر کی۔ اس تقریر میں انہوں نے کہا کہ واحد چیز جس کو لینے کا میں نے تہیہ کر رکھا ہے وہ مکمل آزادی ہے۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں اس کو پسند کروں گا کہ میں باہر کے ایک ملک میں مرجاؤں جب کہ وہ ایک آزاد ملک ہو۔ اور اگر آپ ہم کو ہندوستان میں آزادی نہیں دیتے تو مجھے یہاں انگلینڈ میں آپ کو ایک قبر کی جگہ دینی پڑے گی:

The only thing to which I am committed is complete independence, I will not go back to a slave country. I would prefer to die in a foreign country so long as it is a free country. And if you do not give us freedom in India, you will have to give me a grave here (in England).

مذہب آزادی کے اعتبار سے یہ الفاظ بڑے سزا مندار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر مذہب توحید کے اعتبار سے وہ بالکل بے قیمت ہیں۔ آزادی اور سیاست کے مذہب میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ کوئی قوم آزاد ہے یا محکوم۔ مگر مذہب توحید میں اس نوعیت کی تقسیم محض اضافی ہے۔ مذہب توحید (یا اسلام) کے نقطہ نظر سے ساری اہمیت آخرت کی ہے۔ مومن کو سب سے زیادہ جس بات کا احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ لوگ جہنم سے بچیں اور جنت کے راستہ کو اختیار کریں۔ قومی سیاست کو لے کر اٹھنے والے آدمی کی نظر میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ آزادی اور محکومی کا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مومن کی نظر میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ جنت اور جہنم کا ہوتا ہے۔ وہ دوسری تمام باتوں کو نظر انداز کر کے اسی ایک بات پر اپنی ساری توجہ لگا دیتا ہے۔ کیوں کہ حقیقی مسئلہ صرف وہ ہے جو ابدی زندگی سے تعلق رکھتا ہو۔ باقی تمام مسائل اضافی اور غیر حقیقی ہیں۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مولانا محمد علی کی تقریر شہادت غیر حق کی مثال ہے۔ انہوں نے انگریزوں

کے سامنے یہ گواہی دی کہ سیاسی محکومی سے نجات سب سے بڑا مسئلہ ہے، حالانکہ انھیں یہ گواہی دینا چاہئے تھا کہ جہنم کے عذاب سے نجات سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ انھوں نے انگریزوں کو بتایا کہ سب سے زیادہ اعلیٰ چیز سیاسی آزادی ہے۔ حالانکہ انھیں چاہئے تھا کہ انگریزوں کو یہ بتائیں کہ سب سے زیادہ اعلیٰ چیز جنت ہے۔ اس لئے تم لوگ اپنے رب کی رحمت و مغفرت کے طالب بنو تاکہ تم موت کے بعد جنت میں داخل ہو :

وسارعوا الی مغفرة من ربکم وجنة عرضها السموات والارض اعدت للمتقين (آل عمران ۱۳۳)

اور تم لوگ اپنے رب کی بخشش کی طرف دوڑو اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ وہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

پیغمبروں کو تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے زمانہ میں بھی سیاسی محکومی کے مسائل تھے۔ مگر وہ سیاسی محکومی سے نجات کا نعروں لے کر نہیں اٹھے۔ بلکہ لوگوں کو توحید اور آخرت کی طرف اپکارا۔

مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصر میں ایک بیرونی خاندان ہیکسوس (Hyksos Kings) کی حکومت تھی۔ مگر حضرت یوسف نے اس بیرونی حکمرانی کو اٹھو نہیں بنایا جیسا کہ آپ کے بعد مصر کے قوم پرستوں نے بنایا۔ حتیٰ کہ آپ اسی بیرونی بادشاہ کے تحت "خزائن الارض" کے شعبہ کے نگران بن گئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں فلسطین میں رومیوں کی حکومت تھی جو باہر سے آکر فلسطین پر قابض ہو گئے تھے۔ اس وقت فلسطین میں پیلاطس (Pontius Pilate) رومی گورنر کی حیثیت سے مقیم تھا۔ مگر حضرت مسیح نے اس معاملہ کو اپنی تحریک کا شونہیں بنایا۔ آپ نے اپنی ساری توجہ اس پر مرکوز کر دی کہ لوگوں کو جہنم سے ڈرائیں اور انھیں جنت کی بشارت دیں۔

مومن کا کام یہ ہے کہ وہ توحید اور آخرت کو اپنی دعوت کا عنوان بنائے اور دوسری تمام چیزوں کو فیصلہ الہی کے خاتمہ میں ڈال دے۔ مومن کا کام حق کی گواہی دینا ہے۔ اہل ایسان اگر دوسری دوسری چیزوں کو تحریک کا عنوان بتا کر اس کے لئے دھوم مچائیں تو یہ غیر حق کی شہادت کے بہمنی ہو گا۔ اور اہل ایمان کے لئے جس خدائی نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ شہادت حق کے کام پر ہے۔ شہادت غیر حق کے کام پر انھیں ہرگز خدائی نصرت ملنے والی نہیں۔

## معجزہ کیا ہے

معجزہ کے لفظی معنی ہیں عاجز کر دینے والا۔ پیغمبروں کو معجزات اسی لیے دیے گئے تاکہ لوگ ان کی صداقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ معجزہ کو مخاطب کے اپنے میدان کے اعتبار سے معجز ہونا چاہیے۔ کیوں کہ آدمی کو جب تک اپنے مخصوص میدان میں عجز کا تجربہ نہ ہو وہ صحیح طور پر اس کی اعجازی حیثیت کا احساس نہیں کر سکتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، جن کا زمانہ چودھویں اور تیرھویں صدی قبل مسیح ہے، انھوں نے مہر کے جادو گروں کے سامنے دعویٰ تقریر کی۔ مگر وہ اس سے متاثر نہ ہو سکے۔ لیکن جب انھوں نے جادو گروں کے سانپوں کے مقابلہ میں زیادہ بڑے سانپ کا کرشمہ دکھایا تو تمام جادو گر سجدہ میں گر پڑے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے نظریاتی دلائل کا وزن محسوس کرنے کے باوجود اپنے مخصوص میدان میں پھر بھی وہ اپنے آپ کو موسیٰ سے فائق سمجھ رہے تھے۔ مگر موسیٰ کا عصا جب ان کے سانپوں سے زیادہ بڑا سانپ بن کر ظاہر ہوا تو حضرت موسیٰ کی عظمت آخری طور پر ان کے اوپر منکشف ہو گئی۔ اس کے بعد ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ دل سے حضرت موسیٰ کا اعتراف کر لیں۔

اسی لیے پیغمبروں کو جو معجزہ دیا جاتا ہے وہ مخاطب کے اپنے میدان کے اعتبار سے دیا جاتا ہے۔ مہر کے جادو گروں کو یہ فخر تھا کہ وہ رسیوں کو سانپ کی صورت دے سکتے ہیں۔ تو حضرت موسیٰ کے عصا کو زیادہ بڑا سانپ بنا کر انھیں دکھایا گیا۔ شام و فلسطین کے طیب عام مریضوں کو اچھا کرتے تھے تو حضرت مسیح کو یہ خصوصیت دی گئی کہ ناقابل علاج امراض میں مبتلا لوگ صرف ان کے چھونے سے اچھے ہو جائیں۔ عرب کے لوگوں کو اپنے ادب پر فخر تھا تو پیغمبر اسلام کو قرآن کی صورت میں ایسا برتر ادبی نمونہ دیا گیا جس کے آگے ان کے تمام ادبی شہ پارے بیچ نظر آنے لگے اور کہنے والے کہ پڑے کہ: اَبْعَدُ الْقُرْآنَ۔

خدا کا داعی اپنی ذات میں اپنی صداقت کا ثبوت ہوتا ہے۔ مگر مخاطبین عام طور پر اس کا ادراک نہیں کر پاتے۔ اس وقت خدا یہ کرتا ہے کہ مخاطبین کی اپنی فوقیت کے میدان میں انھیں داعی کے مقابلہ میں زیر کر دیتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے تاکہ داعی حق کی صداقت اس کے مخاطبین کے اوپر ناقابل انکار درجہ میں واضح ہو جائے۔

## سیاست نہیں آخرت

یہ ۲۷ ستمبر ۱۹۷۲ء کا واقعہ ہے۔ مولانا سید احمد مدنی، صدر جمعیتہ علماء ہند مصر اور سعودی عرب کے سفر سے واپس لوٹے تھے۔ مسجد عبدالنبی (نئی دہلی) میں ایک مجلس تھی۔ لوگ مولانا سے سوال کر رہے تھے اور مولانا لوگوں کو ان کے سوال کا جواب دے رہے تھے۔ سوالات کے دوران ایک صاحب نے پوچھا: مولانا موجودہ حالات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ مولانا احمد مدنی نے اس کے جواب میں کہا:

”مسلمان جب تک سیاست کے غم میں مبتلا رہے گا، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کی نہایت غلط تشریح ہے کہ انبیاء علیہم السلام سیاسی نظام قائم کرنے کے لیے آتے تھے۔ انبیاء کے سامنے اصلاً آخرت ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کو خدا کے غضب سے ڈالتے تھے۔ ان کا حال اس باپ کا سا ہوتا تھا جس کا لڑکا آگ کے شعلہ میں گر رہا ہو اور وہ اس کو اس سے کھینچنے کی کوشش کرے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا نقصان مسلم لیگ نے پہنچایا ہے۔ تقسیم کی تحریک نے نفرت کی جو آگ پھیلائی، اس نے ملک کے دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے اتنا دور کر دیا کہ اب ہماری کوئی بات صحیح روشنی میں دیکھی نہیں جاتی۔ تعصب کے جواب میں جو تعصب پیدا ہوا، اس نے ساری راہیں مندود کر دیں۔ میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ (مولانا سید حسین احمد مدنی) سے سنا ہے کہ کلکتہ کی مسجد جو مسجدنا خدا کے نام سے مشہور ہے، صرف اس ایک مسجد میں تقسیم سے پہلے یہ حال تھا کہ ہر روز تقریباً ایک سو آدمی آکر اسلام قبول کرتے تھے، تقسیم سے پہلے کچھ دنوں تک مولانا حسین احمد مدنی مسجدنا خدا میں خطیب تھے، یہی کیفیت پہلے سارے ملک میں تھی۔ ہر روز لوگ سیکڑوں کی تعداد میں اسلام کے حلقہ میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ تقسیم کی منافرت کی پالیسی کے نتیجہ میں ختم ہو گیا۔“ (الجیوے ویکلی، دہلی، ۲۴ مارچ ۱۹۷۳ء، صفحہ ۳)

موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ہر قیمت پر دعوت کے مواقع کو دوبارہ زندہ کریں۔ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو اندیشہ ہے کہ وہ خدا کے قانون کی زد میں آجائیں گے اور پھر کوئی چیز نہ ہوگی جو انہیں خدا کی پکڑ سے بچا سکے۔

## تاریخ کا ایک صفحہ

سترہ سال پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف نے ”تاریخ سے سبق“ کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس میں سیاسی پارٹیوں کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اسلامی تحریک کو سیاسی انداز سے نہیں چلایا جاسکتا۔ موجودہ زمانہ میں انسان عام طور پر اس انداز میں سوچتا ہے کہ سماج کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچہ کو کس طرح بدلا جائے اور اس کو کس طرح نئی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ ماحول میں اس طرز فکر کا رواج اسلام کے خادموں کے لیے ”فتنہ“ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ہم نے اس سے بچنے کی کوشش نہ کی تو ہم خدا کے دین کو سیاست بنا کر رکھ دیں گے اور اس کے بعد ان تمام نتائج سے دوچار ہوں گے جو سیاسی تحریکوں کے لیے مقدر ہیں۔ (زندگی رامپور ذی الحجہ ۱۳۷۹ھ)

اس کے بعد اگلے سال بدایوں (یوپی) میں مسلمانوں کا ایک بڑا دینی اجتماع ہوا جس میں دوبارہ اظہار خیال کا موقع ملا۔ اس موقع پر راقم الحروف نے ۱۶ اپریل ۱۹۶۱ء کی نشست میں ایک مفصل تقریر کی۔ یہ تقریر اسی زمانہ میں ”قرآن کا مطلوب انسان“ کے عنوان سے رسالہ زندگی رامپور میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ایک حصہ یہاں رسالہ بڈکور کے قدیم فائل سے نقل کیا جا رہا ہے :

”یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام چیزوں کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ ایک ہی چیز سے آدمی نصیحت بھی حاصل کر سکتا ہے اور وہی بیک وقت اس کے لیے فتنہ میں پڑنے کا بھی ذریعہ ہے۔ یہی حال خدا کی کتاب کا بھی ہے۔ بلاشبہ قرآن کتاب ہدایت ہے مگر قرآن سے آدمی کو وہی کچھ ملے گا جو وہ اس سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

قرآن کے ذریعے راہ ہونے کی ایک صورت وہ ہے جس کو قرآن میں مضامین کہا گیا ہے (توہبہ ۳۰) مضامین کے معنی عربی زبان میں ہیں : مشاکلۃ الشیء بالشیء (سان العرب) یعنی کسی چیز کو دوسری چیز کے ہم شکل قرار دینا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذنیوی مصالح کی بنا پر اجنبی خیالات سے متاثر ہو کر ایک غیر قرآنی بات کو قرآنی بنا کر پیش کیا جائے۔

مضامین کی یہ خرابی آدمی کے اندر خاموشی کے ساتھ داخل ہو جاتی ہے۔ یہ خیال کہ جو بات

لوگوں سے کہنی ہے وہ ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کے ذہن سے قریب تر ہو تاکہ وہ اس کو مقبول کر سکیں اور دوسرے یہ کہ بات کو ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں پیش کیا جائے کہ وقت کا معیار فکر اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو، وقت کے علمی خیالات کے ساتھ وہ پہلو پر پہلو جگے سکے۔ یہ طرز اگرچہ بذات خود غلط نہیں ہے مگر بعض مرتبہ وہ آدمی کے ذہن میں خدائی تعلیمات کی ایسی تصویر بنا دیتا ہے جو اصل تعلیمات سے زیادہ وقت کے نظریات سے مطابقت رکھنے والا ہو۔ حسدانی تعلیمات سے جزوی مشابہت تو ضرور اس میں موجود رہتی ہے مگر درحقیقت وہ اسلامی الفاظ اور اصطلاحات میں غیر اسلامی خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

اگر بے جا جسارت نہ ہو تو میں عرض کروں گا کہ تصوف جو بعض محققین کے نزدیک یونانی لفظ تھیوسوفیا (Theosophia) کی تعریف ہے، وہ بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے جو دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں محض خارجی اثرات کے تحت اسلام کے اندر داخل ہو گیا۔ ہمارے قدیم بزرگ جب اسلام کا پیغام لے کر عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں گئے تو انھوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جہاں کچھ مخصوص افکار و اشغال لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے اور مذہب اور مذہبی زندگی کا تصور ان کے بنی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان افکار و اشغال کی پشت پر ایک زبردست فلسفہ بھی موجود تھا۔ ان چیزوں نے کچھ دعوتی مصلحت اور کچھ انفعالی تاثر کے تحت ہمارے بزرگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اسلام کو اس رنگ میں پیش کریں جس سے لوگ پہلے سے مانوس ہیں۔ اس طرح نبوت کے دو سو سال بعد اسلام کی مقصودانہ تعبیر ہماری تاریخ میں داخل ہو گئی۔

اب قدیم رومانی انداز میں سوچنے کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جبکہ ہر طرف معاشی اور سیاسی تحریکوں کا زور ہے۔ آج کا انسان عام طور پر اس انداز میں سوچتا ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچہ کو بدل کر کسی اور بنیاد پر دنیا کا نظام چلایا جائے۔

## قانون فطرت

ایک دعوت سچے اسلام کی دعوت ہو اور آپ اس کا انکار کریں تو یہ انکار ہمیشہ جنت کی قیمت پر ہوتا ہے۔ ایسی ایک دعوت کا انکار کر کے آدمی دنیا میں اپنے کو دقتی رسوائی سے بچاتا ہے اور آخرت کی ابدی رسوائی کا خطرہ مول لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت ہنگامہ سدا ہے۔ اس لئے جب ایک اسلامی دعوت کے مقابلہ میں اپنے رویہ کا فیصلہ کرنا ہو تو آدمی کو بے حد سنجیدہ غور و فکر کے بعد اس کا فیصلہ کرنا چاہئے۔

اس سلسلہ میں ایک اور سنگین بات ہے جو آدمی کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ وہ اللہ کی سنت استبہا ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ رسول کے مخالفین نے جب رسول کی دعوت کا انکار کیا تو انھوں نے کہا کہ خدا کو اگر اپنا پیغمبر بھیجنا تھا تو اس نے انسان کو کیوں ہمارے پاس بھیجا، فرشتہ کو کیوں نہ بھیجا۔ تاکہ ہم کو سچا بنائے میں شبہ نہ ہوتا اور ہم اس کو خدا کا نمائندہ مان کر فوراً اس کے موہن بن جاتے۔ فرمایا کہ انسانی پیغمبر کے بجائے اگر ہم کوئی فرشتہ بھیجتے تو اس کو بھی فرشتہ کے طور پر نہ بھیجتے بلکہ انسان کی صورت میں بھیجتے۔ اور اس طرح دوبارہ ان کو اسی شبہ میں ڈال دیتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں (انعام ۹) چونکہ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اس لئے یہاں لازماً حق پر الہام کا پردہ ڈال کر لوگوں کے سامنے لایا جاتا ہے۔ یہاں ”خدا کے نمائندہ“ کو بھی ایک عام انسان کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کے لئے شبہ کی گنجائش باقی رہے۔

یہی چنانچہ کا مقام ہے۔ اللہ نے دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے جو شبہ کے پردہ کو بھانڈ کر حق تو اس کی برہنہ صورت میں دیکھ لیتا ہے اور کون ہے جو شبہ میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ خدا کے منصوبہ کے مطابق انسان کو بہر حال اس امتحان میں کھڑا ہونا ہے کہ وہ ایک مخلوق کی صورت میں خالق کی تخلیقات کو دیکھے۔ ایک انسان کی آواز میں خدا کی آواز کو سنے مدنیوی شان و شوکت سے خالی ایک دعوت میں آخرت کی شان و شوکت کی رونقیں پائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو اگر حق کا انکار کرنے کے لئے ایک ”دلیل“ ہاتھ آگئی ہو تو اس کو ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ اپنے رویہ کے حق میں ایک مضبوط بنیاد کو پا گیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ جس چیز کو دلیل سمجھ رہا ہے وہ محض ایک فریب ہو۔ اس کے ذہن نے شبہات سے متاثر ہو کر بطور خود ایک تصویر بنا لی ہو۔ وہ اس کا ایک ذہنی سایہ ہو جس کو وہ حقیقت سمجھ بیٹھا ہو۔ ”شبیہ میں ڈالنے“ کی سنت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ حق اگر اپنی موافقت میں دلیلیں رکھتا ہو تو کسی کے ساتھ آدمی کو اس کی مخالفت میں بھی دلیلیں ہاتھ آجائیں۔ اگر ایسے پہلو پائے جاتے ہوں جو دعوت کو سچی دعوت ثابت کرتے ہوں تو کسی کے ساتھ یہ امکان بھی موجود ہو کہ کوئی شخص اس میں ایسے شورٹے دریافت کرے جس کی بنیاد پر وہ اس کی گمراہی کا اعتقاد کر سکے۔ قرآن میں ہے کہ ”کون ہے جو اللہ کو قرض دے“ اس کو دیکھ کر ایک شخص نے کہا۔ ”خدا بھی محتاج ہو گیا ہے جو اس کو بندوں سے ادھار مانگنے کی ضرورت پڑی۔ اگر آدمی کا ذہن صحیح نہ ہو تو وہ خدا کی کتاب میں بھی احتیاج اعتراضات تلاش کر سکتا ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ قرآن میں ”قرض“ کے بجائے کوئی دوسری تعبیر اختیار کرنی چاہئے تھی تو یہ بے معنی بات ہوگی۔ کیوں کہ قرض کا لفظ اگر قرآن میں نہ ہوتا تو آدمی اپنے بے معنی اعتراضات کے لئے کوئی اور لفظ تلاش کر لیتا۔

## دعوت الی اللہ

مصطفیٰ محمد عمارۃ کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے: جواہر البخاری و شرح القسطلانی۔ اس کتاب میں امام بخاری اور شیخ قسطلانی کی کتابوں سے ۸۰۰ سے زیادہ حدیثیں منتخب کر کے مختلف عنوانات کے تحت درج کی گئی ہیں۔ ضخیم کتاب میں ہر قسم کے عنوانات ہیں مگر ”دعوت الی اللہ“ یا اس کے ہم معنی کوئی عنوان موجود نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ مصنف کو دعوت و تبلیغ سے متعلق احادیث پہنچیں نہیں۔ انہوں نے جن حدیثوں کو پڑھا اور سنا ان میں یقیناً دعوت و تبلیغ والی حدیثیں موجود تھیں۔ مگر ذہن کی مخصوص ساخت کی وجہ سے وہ ان کے ذہن کا جزو نہ بن سکیں۔

خود مصنف کی زیر نظر کتاب سے ثابت ہے کہ ان کو دعوت و تبلیغ کی احادیث پہنچیں تھیں۔ مگر ان کے ذہن سے ان کا دعوتی مفہوم اوجھل رہ گیا۔ چنانچہ انہوں نے ان احادیث کو دعوت و تبلیغ کے خانہ میں درج نہیں کیا بلکہ کسی اور خانہ میں ان کو نقل کر دیا۔

کتاب کے صفحہ ۲۹۶ پر یہ حدیث ملتی ہے:

عن ابی موسیٰ الاشعری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مثل ما بعثنی اللہ بہ کمثل رجل اتی قومًا فقال رأیت الجیش بعینتی وانی انا النذیر العریان فالنجاء النجاء فاطاعته طائفة فادلجوا علی ما لم یسئلوا ففجوا وکذبته طائفة فصبحوہم الجیش فاجتاحہم۔

ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری مثال اور اس چیز کی مثال جس کو لے کر خدا نے مجھے بھیجا ہے اس آدمی کی سی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے دشمن کا لشکر دیکھا ہے اور میں تم کو کھلا ڈرانے والا ہوں پس بچو بچو۔ پھر ایک گروہ نے اس کی بات مانی اور رات کو سویرے چل پڑا اور وہ بچ گیا۔ دوسرے گروہ نے نہ مانا چنانچہ صبح کو دشمن کا لشکر اس پر ٹوٹ پڑا اور اس کو ہلاک کر ڈالا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا تو اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ آپ لوگوں کے سامنے ”نذیر عریاں“ بن جائیں اور ان کو قیامت کے

آنے والے ہولناک دن سے آگاہ کر دیں۔ جو شخص آپ کی بات مان کر اپنی اصلاح کر لے گا وہ جنت میں جائیگا۔ اور جو شخص آپ کی بات نہیں مانے گا اور اس کے مطابق اپنے کو درست نہیں کرے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

یہ حدیث واضح طور پر دعوت و تبلیغ کے بارہ میں ہے مگر صاحب کتاب نے اس کو جس عنوان کے تحت درج کیا ہے وہ یہ ہے:

باب الخوف من الله تعالى والانهاء عن المعاصي والجنة قريسة -

اللہ تعالیٰ کا خوف اور گناہوں سے رکنا اور یہ کہ جنت قریب ہے۔

بعد کے زمانہ میں لکھی جانے والی اکثر کتابوں کا یہی حال ہے۔ ان کتابوں میں آپ طہارت سے لے کر قتال تک کے تمام ابواب پائیں گے۔ مگر دعوت الی اللہ اور تبلیغ ما انزل اللہ کا اس میں کوئی باب نہ ہوگا۔ یہ صرف عام مصنفین کا حال نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے علماء اور مصنفین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

یہی سبب ہے کہ بعد کے دور میں مسلمانوں میں ہم ہر طرح کی سرگرمیاں دیکھتے ہیں مگر دعوت الی اللہ اور شہادت حق کی سرگرمی ہمیں ان کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ اسلام کی اشاعت کا کام کسی بھی دور میں بند نہیں ہوا۔ ہر دور میں خدا کے بند سے بے شمار تعداد میں خدا کے دین میں داخل ہوتے رہے اور آج بھی داخل ہو رہے ہیں۔ مگر یہ سب زیادہ تر اسلام کی اپنی توت سے ہو رہا ہے نہ شعوری طور پر مسلمانوں کی کسی دعوتی جدوجہد سے۔

بعد کی تاریخ میں مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی یہ سب سے بڑی کمی ہے جس نے مسلمانوں کو غیر مسلمین کے مقابلہ میں خدا کی نصرت سے محروم کر دیا ہے، جب تک اس کمی کو دور نہ کیا جائے مسلمانوں کو کبھی دنیا میں برتری کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔

موجودہ زمانہ میں بظاہر مسلمانوں کے درمیان ”دعوت اسلامی“ کا کافی چرچا نظر آ رہا ہے۔ مگر ان کی کارروائیوں کو دیکھنے اور ان کی کافر نسوں میں شرکت کے بعد میرا احساس یہ ہے کہ مختلف اسباب سے لوگ دعوت کا نام تو لے رہے ہیں۔ مگر شاید ان پر یہ واضح نہیں کہ دعوت سے حقیقتہً کیا مراد ہے۔ لوگ سیاسی ہنگامے پر پا کرتے ہیں اور قومی مسائل پر پر جوش تقریریں کرتے ہیں اور اسی کو دعوت کا عنوان دے رہے ہیں۔ حالانکہ دعوت خدائی پیغامِ رسائی کا نام ہے نہ کہ قومی اور مادی ہنگامہ آرائی کا۔

## ایک تشریح

مشہور حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص کسی مسکرو کو دیکھے تو وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے اس کو بُرا کہے۔ اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو تو دل میں اس کو برا سمجھے، اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ برائی پر صبر کرنا رخصت کی بات ہے، وہ مومن کے لیے عزیمت یا اعلیٰ درجہ کی پسندیدہ بات نہیں۔

دوسری طرف قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر فرمایا گیا ہے کہ صبر کرو، کیوں کہ صبر کرنا عزیمت کی بات ہے۔ وہ اولوالعزم پیغمبروں کا طریقہ ہے (الاحقاف ۲۵) یہ دونوں باتیں بظاہر ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ پھر ان کے درمیان تطبیق کیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ دونوں حکم الگ الگ موقع کے لیے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو حدیث ہے، اس کا تعلق مسلم سوسائٹی سے ہے۔ اور صبر کی مذکورہ آیتوں کا تعلق غیر مسلموں میں دعوت تبلیغ سے۔ دونوں حکموں کا محل ایک دوسرے سے جدا ہے۔

مسلم معاشرہ کی داخلی اصلاح کے لیے یہ مطلوب ہے کہ ہر مسلمان کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اسپرٹ موجود ہو۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر زیادتی کرے تو پورا معاشرہ اس کا سخت نوٹس لے۔ لوگ ظالم کا ہاتھ پکڑنے کے لیے دوڑیں۔ زبان سے اس کی مذمت کریں۔ اور بالفرض کوئی مسلمان ایسا کرنے کی حالت میں نہ ہو تو اس قسم کا واقف دیکھ کر اس کے دل میں سخت کراہت پیدا ہونی چاہیے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو ایسے آدمی کا ایمان ہی مشتبہ ہو جائے گا۔

مگر جہاں تک دعوت کے عمومی کام کا تعلق ہے، اس میں عزیمت ہی ہے کہ صبر کیا جائے۔ یہاں مدعو کی زیادتیوں پر صبر کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ اگر مدعو کی زیادتیوں پر صبر نہ کیا جائے تو داخلی اور مدعو کے درمیان وہ معتدل فضا ہی نہیں بنے گی جو دعوتی عمل کی صحیح انجام دہی کے لیے ضروری ہے۔

## احیاءِ ملت

احیاءِ امت کا کام اصلاً احیاءِ افراد کا کام ہے۔ یہ کام سٹیج کی تقریروں اور جلسہ جلوس کے ہنگاموں کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کو جماعتی اور تنظیمی ڈھانچہ بنا کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کام کے لیے خاموش قسم کی فکری ہم درکار ہے جس کو موثر ترین سطح پر اٹھایا جائے اور اس کو ہر طرف سے یکسو ہو کر مسلسل چلایا جاتا رہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کے اندر مطلوبہ ذہنی انقلاب آجائے۔ امت میں نئی سوچ اور نیا مزاج رکھنے والے افراد پیدا ہو جائیں۔

یہ افراد وہ ہیں جو اسلام کو از سر نو دریافت کریں۔ جن کی معرفت اتنی بڑھے کہ براہِ راست خدا سے ان کا اتصال قائم ہو جائے۔ صبح و شام ان کو رزقِ رب ملنے لگے۔ پوری دنیا ان کے لیے ایمانی غذا کا دسترخوان بن جائے۔ آخرت کا استحضار ان کے اوپر اتنا طاری ہو گیا کہ وہ جنت اور جہنم کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی زندگی عملِ صالح کا نمونہ بن جائے۔ وہ اس احساس کے ساتھ بولیں کہ ان کے الفاظ انسانوں تک پہنچنے سے پہلے خدا تک پہنچ رہے ہیں۔ وہ جو کچھ کریں یہ سوچ کر کریں کہ وہ اپنے ہر عمل کے لیے مالکِ کائنات کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ان کا ایک شخص جب دوسرے شخص کے ساتھ معاملہ کرے تو اس کو نظر آ رہا ہو کہ ان کے ساتھ ایک تیسرا بھی شریک ہے اور وہ اللہ ہے۔

ایمان کے اثر سے ان کا شعور اس طرح جاگ اٹھے کہ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھنے لگیں جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔ وہ دلیل اور مغالطہ کے درمیان تمیز کرنے لگیں۔ وہ شعوری طور پر جان لیں کہ کب دو چیزوں میں ظاہری مشابہت کے باوجود فرق ہوتا ہے اور کب دو چیزوں میں ظاہری فرق کے باوجود مشابہت۔ وہ عمر کے حالات میں ٹیڑھے سرے کو پالیں۔ وہ اس حقیقت کا ادراک کر لیں کہ ہونے کے بعد ان کی حیثیت داعی کی ہو چکی ہے اور بقیہ لوگوں کی حیثیت مدعو کی۔ اور جہاں دو گروہوں کے درمیان داعی اور مدعو کی نسبت قائم ہو جائے وہاں سارا معاملہ یک طرفہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مدعو کے اوپر داعی کا کوئی حق نہیں، اس کی صرف ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں جن کو اسے آخری حد تک ادا کرنا ہے اور ان کو ادا کرتے ہوئے اسے اپنے رب تک پہنچ جانا ہے۔

## مدافعت نہ کہ جارحیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے بعد مکہ میں تیرہ سال تک رہے۔ اس مدت میں مکہ کے منکروں کی طرف سے ہر قسم کا ظلم کیا گیا۔ مگر آپ صرف صبر کرتے رہے۔ آپ اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ یہ کہتے کہ اپنے ہاتھ روک رکھو (کفو ایدیم) ہجرت کے بعد قریش سے لڑائیاں شروع ہوئیں۔ مگر یہ لڑائیاں آپ کے لئے مدافعت لڑائیاں تھیں۔ کیونکہ ان لڑائیوں میں جارحیت کا مظاہرہ اولاً قریش کی طرف سے کیا گیا۔ ردھم بدو اکم ادل مرة) سورہ بقرہ میں مسلمانوں کو جنگ کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (۱۹۰) اس کی تشریح میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ای الذین یدوونکم بالقتال (یعنی ان سے جنگ کرو جنہوں نے تم سے جنگ میں ابتدا کی ہے)

ابتدائی تین بڑے غزوات مدینہ کی سرحد پر یا اس سے بہت قریب ہوئے۔ مدینہ سے مکہ کا فاصلہ ۲۰۰ میل ہے۔ مگر اسلام کا پہلا غزوہ بدر (رمضان ۱) بدر نامی مقام پر ہوا جو مدینہ سے صرف ۲۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ دوسرا بڑا غزوہ احد (شوال ۲) احد پہاڑ کے پاس ہوا جو مدینہ سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ تیسرا بڑا غزوہ احزاب (ذی قعدہ ۳) عین مدینہ کی سرحد پر ہوا۔ گویا ہر بار آپ کے مخالفین چڑھائی کر کے آپ کے مقام پر آئے۔ نہ کہ آپ چڑھائی کر کے ان کے مقام پر گئے۔

ان غزوات کا جغرافی محل وقوع ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ آپ کے مخالفین نے آپ پر جارحانہ اقدام کیا تھا اور آپ صرف مدافعت میں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلے۔ یہ عمل دلیل آئی واضح ہے کہ اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کا انحصار اصلاً جس چیز پر ہے وہ دعوت ہے۔ دعوت اسلام کی سب سے بڑی قوت ہے جو ہمیشہ دوسری تمام قوتوں پر بالائے نامت ہوتی ہے۔ اسلام کی پالیسی ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ وہ اپنی اس بے خطا قوت کو استعمال کرے۔ اسلام میں صبر کی تاکید اسی لیے کی گئی ہے کہ معتبلا کے میدان کو دعوت سے باہر نہ جانے دیا جائے۔ لہذا یہ کہ منبرین ثنائی خود ہی اپنی کارروائیوں کی وجہ سے مجبور کر دے۔ اسلام دعوت کے میدان میں مقابلہ کرتا ہے نہ کہ جنگ کے میدان میں۔

باب دوم :

# عملِ دعوت

## دعوتی عمل

یہ بات تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ اسلام کا دعوتی عمل جاری رہنا ضروری ہے تاکہ اس کا پیغام ہر دور میں تمام نسلوں تک پہنچ سکے۔ یہ کام کیسے ہو۔ موجودہ زمانہ میں اس کے بارہ میں مختلف نقطہ نظر ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام کے طور پر قائم و نافذ کیا جائے تاکہ لوگ اس کی برکتوں کا عملی تجربہ کریں۔ اس طرح وہ اسلام کے کمالات کے قائل ہو کر اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ دوسرے گروہ کا ذہن یہ ہے کہ ہر مسلمان کے اندر اسلامی عمل اور اسلامی کردار پیدا کیا جائے۔ جب دوسری قومیں مسلمانوں کو چلتے پھرتے دیکھیں گی تو وہ اپنے آپ اسلام قبول کر لیں گی۔

ان لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اشاعت اسلام کا عمل تو پچھلے ہزار سال کے دوران مسلسل جاری تھا، وہ صرف بیسویں صدی میں ہی سہجہ منقطع ہوا ہے۔ حالانکہ ابتدائی کئی دور کے بعد پھر اس انداز کی دعوتی جدوجہد دوبارہ کبھی نہیں کی گئی۔ ایسی حالت میں اس کا سبب کیا تھا۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اب ایک محمود اور محکم اور محفوظ دین ہے۔ اس کی برہنہ شہادت عالمی سطح پر بالفعل قائم ہو چکی ہے۔ اس بنا پر اس کے پھیلنے کے لیے اب ذرا براہ راست تبلیغ کی شرط ہے اور نہ عملی نظام کی موجودگی یا اصلاح یافتہ مسلمانوں کی نمائندگی ضروری ہے۔ اب وہ اپنے آپ لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، شرط صرف یہ ہے کہ اسلام اور دوسری قوموں کے درمیان نفرت کی فضا نہ پائی جائے۔

قدیم زمانہ میں کبھی نفرت کی فضا موجود نہ تھی۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں مسلسل اسلام کی اشاعت کا عمل جاری رہا۔ موجودہ زمانہ میں نااہل لیڈروں نے ساری دنیا میں یہ کیا کیا انہوں نے اسلام کے نام پر ٹکراؤ کی سیاست چلائی اور جدید میڈیا نے اس کو خوب مشہور کیا۔ اس کے نتیجہ میں تاریخ میں پہلی بار اسلام اور دوسری قوموں کے درمیان نفرت کی فضا قائم ہو گئی۔ یہی نفرت کی فضا اسلام کے اشاعتی عمل کو جاری رکھنے میں رکاوٹ بن گئی۔

اسلام کے نام پر ٹکراؤ اور احتجاج کی سیاست نے موجودہ زمانہ میں اسلام کی اشاعت کے عمل کو روک دیا ہے۔ اب ضرورت صرف یہ ہے کہ اس لایعنی سیاست کو ترک کر دیا جائے۔ اس کے بعد اسلامی دعوت کا عمل اپنے آپ جاری ہو جائے گا، جیسا کہ وہ ماضی میں مسلسل اپنے آپ ہر جگہ جاری تھا۔

## تعمیری لاوا

زمین کے اوپر جس طرح ندیاں بہتی ہیں، اسی طرح زمین کے اندر لاوا (Lava) بہتا ہے۔ لاوا پگھلی ہوئی چٹانیں ہیں۔ ان کا درجہ حرارت ایک ہزار ڈگری یا اس سے کچھ کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ یہ لاوا اپنی نالیوں (Vulcano) کے راستے سے بہتا ہوا کبھی کبھی زمین کے اوپر آجاتا ہے۔ اس وقت ہم کہتے ہیں کہ فلاں مقام پر جو لاکھی پھٹ پڑا۔

انسانی آبادیوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ مثلاً ۹۰-۱۹۸۹ میں کئیر میں گولی اور بم کا ایک طوفان جاری ہو گیا۔ یہ بھی ایک انسانی لاوا تھا۔ کئیر کے لوگ ۱۹۴۷ کے بعد سے احساس محرومی کا شکار ہو رہے تھے۔ اس کے نتیجے میں ان کے اندر شکایتوں کا لاوا ایک رہا تھا جو آخر کار پھٹ پڑا۔ یہ تخریبی لاوا کی مثال تھی۔ اسی طرح ایک اور لاوا ہے جس کو "تعمیری لاوا" کہہ سکتے ہیں۔ پہلا لاوا تخریب کی نفسیات سے ابھرتا ہے اور دوسرا لاوا تعمیر کی نفسیات سے۔

ایک قوم کے اندر تعمیر ذہن کی تحریک چلائی جائے۔ اس کے اندر ایمان کا جذبہ بیدار کیا جائے اس کے افراد میں اخلاق کو رد نہ پیدا کیا جائے۔ اس کو ایک ایسی قوم بنایا جائے جس کے انسداد باشعور افراد ہوں۔ یہ کام اگرچہ بظاہر ایک خاموش اور دیر طلب کام ہے، مگر وہ لاوا بننے کے عمل سے کم نہیں۔ جب وہ اپنی آخری حد پر پہنچتا ہے تو وہ تعمیری لاوا بن کر پھوٹ پڑتا ہے۔ وہ پورے ماحول میں نیا انقلاب برپا کر دیتا ہے۔

تخریبی لاوا اور تعمیری لاوا دونوں کے نمونے دنیا میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ تخریبی لاوا کی ایک مثال بم ہے اور تعمیری لاوا کی ایک مثال درخت۔

بم پھٹتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنے چاروں طرف تکلیف دہ شور بکھرتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس کی دنیا میں ہر چیز کو برباد کر دیتا ہے۔ بم کا پھٹنا تخریبی لاوا کا پھٹنا ہے۔ جتنا بڑا بم اتنی ہی زیادہ بربادی اور تخریب کاری۔

اس کے بعد درخت کی مثال دیکھے۔ درخت کا لاوا اس کے بیج کے اندر ہوتا ہے۔ درخت کا ایک بیج جب زمین میں ڈالا جاتا ہے تو وہ بھی پھٹتا ہے۔ مگر بیج کے پھٹنے سے کوئی شور برپا

نہیں ہوتا۔ بیج کا پھٹنا مکمل طور پر ایک خاموش انفجار ہوتا ہے۔

پھر یہ کہ بیج جب پھٹتا ہے تو وہ اپنے اندر سے بربادی نہیں نکالتا بلکہ آبادی نکالتا ہے۔ بیج کا پھٹنا ایک سرسبز و شاداب درخت کا ظہور میں آنا ہے جس کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ جس کے نیچے لوگوں کو سایہ ملے۔ جس سے پھول کی خوشبو اور پھل کی خوراک حاصل ہو۔

عام انسانی تحریکیں تخریبی انفجار کے ہم معنی ہیں۔ یہ تحریکیں جب پھٹتی ہیں تو لوگوں کو گولی اور بم کا شور سننا پڑتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ تباہی اور بربادی کے واقعات لے آتی ہیں۔ پوری انسانی آبادی ان کے نتائج کو دیکھ کر حسیخ اٹھتی ہے۔

مگر ایک سچی اسلامی تحریک کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ سچی اسلامی تحریک درخت کے بیج کی مانند ہے۔ اس کا انفجار خاموش انفجار ہوتا ہے۔ سچی اسلامی تحریک سے جو افراد تیار ہوتے ہیں، ان میں کا ہر شخص خدا کا شاداب درخت ہوتا ہے۔ اس قسم کے انسانی گروہ کا پھٹنا خدا کی زمین میں ایک لہلہاتا ہوا باغ وجود میں لانا ہے۔

ایسے لوگ انسانوں کے لیے سراپا رحمت بن کر ابھرتے ہیں۔ وہ سہتے ہیں تاکہ دوسروں کو نہ سہنا پڑے۔ وہ جاگتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ سوئیں۔ وہ اپنے آپ کو محروم کرتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ پائیں۔ وہ جھک جاتے ہیں تاکہ دوسروں کو کھڑا ہو۔ نئے کام شروع ہوتے ہیں۔ وہ کم پر راضی ہو جاتے ہیں تاکہ دوسروں کو زیادہ ملے۔ وہ موت کو قبول کرتے ہیں تاکہ دوسروں کو زندگی حاصل ہو۔ وہ اپنے سینہ کو غم کا قبرستان بناتے ہیں تاکہ دوسروں کے گھروں میں خوشیوں کی بہار آسکے۔

تاریخ میں تخریبی لاوا پھٹنے کی بے شمار مثالیں ہیں، ماضی میں بھی اور حال میں بھی۔ مگر تعمیری لاوا پھٹنے کی مثال مثالی معلوم تاریخ میں صرف ایک ہے، اور وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مثال ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں صحابہ کرام کا اٹھنا اسی قسم کے ایک تعمیری لاوے کا پھٹنا تھا جس کو قرآن میں خیرات کا اخراج (آل عمران ۱۱۰) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان لوگوں کے درمیان جب تخریبی لاوا پھٹتا ہے تو وہ ہر طرف تخریب بکھرتا ہے۔ مگر تعمیری لاوا جب پھٹتا ہے تو وہ ہر طرف تعمیر کا پیمانہ اگا دیتا ہے۔ صحابہ کرام کی صورت میں تعمیر کا جو لاوا پھٹا اس نے ساری دنیا کو اسی قسم کے تعمیری نتائج سے بھر دیا۔

## اسلام کی پکار

اسلام کی تاریخ میں کم سے کم ۱۳ سالہ دور دعوتی محنت (dawa activism) کا دور ہے۔ اور اس کے بعد کا ہر سالہ دور دعوتی عمل (dawa process) کا دور۔ ابتدائی ۱۳ سالہ دور میں پیغمبرؐ اور آپ کے اصحاب نے جو دعوتی محنت کی اس ڈھنگ کی دعوتی محنت، معلوم تاریخ کے مطابق اسلام میں دوبارہ نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود اسلام کی اشاعت اور توسیع مسلسل جاری رہی۔ اسی کے نتیجہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ آج مسلمان دنیا بھر کے تمام ملکوں میں قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی ۱۳ سالہ محنت اتنی عظیم اور ہمہ گیر تھی کہ اس کے اثرات بعد کی انسانی تاریخ میں بطور عمل (process) جاری ہو گئے۔ کلمہ کے انداز کی براہ راست دعوتی محنت کے بغیر اسلام خود اپنی طاقت سے انسانی آبادیوں میں مسلسل پھیلتا رہا۔

اس اشاعتی عمل میں اگر کبھی وقتی رکاوٹ پڑی تو صرف اس وقت پڑی جب کہ مسلمان اور غیر مسلمان (داعی اور مدعو) میں کوئی نزاع یا ٹکراؤ پیش آیا اور اس کی بنا پر دونوں کے درمیان نفرت اور تلخی کی فضا پیدا ہو گئی۔ مثلاً یلیبی جنگوں کے نتیجہ میں یورپ کی کئی قوموں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا ہونا یا ایشیائی ملکوں میں نوآبادیاتی نظام کے سبب سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تلخی اور کشیدگی کا ماحول بن جانا۔ یا ہندوستان میں دو قومی سیاست کے نتیجہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوری پیدا ہو جانا۔

یہ تجربہ بتاتا ہے کہ مذکورہ دعوتی عمل خود اپنی طاقت سے تاریخ میں جاری ہے۔ وہ اگر کبھی رکتا ہے تو صرف ایک سبب سے رکتا ہے، اور وہ ہے — داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات کا ختم ہو جانا۔

ایشیائی نسبت سے اس معاملہ کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں غیر مسلم قومیں جدید قوتوں سے مسلح ہو کر مسلم قوموں پر غالب آ گئیں۔ اس واقعہ کو مسلمانوں نے اپنے لئے قومی ذلت سمجھا اور ساری دنیا میں وہ غیر مسلم قوموں سے لسانی یا عملی جنگ میں مشغول

ہو گئے۔ اس نیکراؤ میں واضح اسباب کی بنا پر مسلمانوں کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس طرح انھیں دوبارہ غلبہ کا مقام تو نہیں ملا، البتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کا پہاڑ کھڑا ہو گیا۔ قدیم زمانہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان لڑائیاں ہوتی تھیں۔ مگر اس زمانہ میں وہ چیز موجود نہ تھی جس کو میڈیا کہا جاتا ہے۔ اس لئے قدیم جنگوں کے اثرات صرف میدان جنگ تک محدود ہو کر رہ جاتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں میڈیا نے اس کو عالمی خبر کی حیثیت دیکر ایک ایک شخص تک اسے پہنچا دیا۔

اب ضرورت ہے کہ پورے معاملے پر از سر نو غور کیا جائے۔ اور ان حالات کو پھر سے تاریخ میں واپس لایا جائے جس میں دعوت کا عمل دوبارہ جاری ہو سکے۔ اس کی صورت صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان ایک طرف ممبر کا طریقہ اختیار کریں۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں، بالفاظ دیگر داعی اور مدعو کے درمیان جو نفرت اور کشیدگی پیدا ہو گئی ہے وہ اتنی گہری ہے کہ اب اس کو صرف ایک طرف کارروائی ہی کے ذریعہ روکا جاسکتا ہے۔ نفرت کی یہ فضا کبھی بھی دو طرفہ بنیاد پر ختم نہیں ہو سکتی۔ ایسی حالت میں مسلمانوں ہی کو یہ کرنا ہے کہ وہ یک طرفہ عمل کے ذریعہ اس کے خاتمے کو یقینی بنا دیں، تاکہ دعوت کا عمل دوبارہ نارمل حالت میں جاری ہو جائے جس طرح وہ پہلے ساری دنیا میں جاری تھا۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں (داعی اور مدعو) کے درمیان نارمل تعلقات انتہائی طور پر ضروری ہیں۔ نارمل فضا میں ہی یہ ممکن ہے کہ ایک شخص دوسرے کے نقطہ نظر پر غور کرے۔ یہ ایک ایسی فطری حقیقت ہے جس کی مثالیں ہر طرف آسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے حال کی ایک سادہ مثال لیجئے۔

۱۳ مئی ۱۹۹۴ء کو دہلی میں میری ملاقات ایک مسلم نوجوان مسٹر منصور سے ہوئی۔ وہ دہلی کے ایک اسکول (ایئر فورس ہال بھارتی) میں پڑھتے ہیں۔ اس وقت وہ بارہویں درجہ کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے اسکول میں جب دو طالب علم آپس میں ملتے ہیں تو امریکی طریقہ کے مطابق وہ ایک دوسرے کو ہائے (Hi) کہتے ہیں۔ مگر ہم چند مسلمان طالب علم جب آپس میں ملتے ہیں تو ہم ایک دوسرے کو السلام علیکم کہتے ہیں۔ غیر مسلم طلبہ نے جب اس کو سنا تو انھوں نے پوچھا

کہ یہ تم آپس میں کیا کہتے ہو۔ انہوں نے بتایا کہ یہ عربی کلمہ ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اوپر سلامتی ہو:

May peace be upon you.

غیر مسلم طلبہ نے اس کو بہت پسند کیا اور کہا کہ گریٹنگ کا یہ کتنا اچھا طریقہ ہے۔ اس کے بعد وہ خود بھی اسلام علیکم کہنے لگے۔ حتیٰ کہ بعض طلبہ اتنا مست اثر ہوئے کہ کہا کہ ہم تمہارے ساتھ نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ ایک غیر مسلم نوجوان نے خاص طور پر درزی سے اپنے لئے مسلم لباس (مشلوار اور قمیص اور ٹوپی) سلوایا اور اس کو بہن کر مسٹر منصور کے ساتھ مسجد میں گیا اور عید کی نماز ادا کی۔ اس طرح ایک طالب علم نے رمضان کے ہسینہ میں ایک روزہ رکھا۔ کئی غیر مسلم طلبہ آپس میں کہنے لگے کہ جمعرات کھاؤ، حلال میٹ کھاؤ، وہ زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ وغیرہ۔

مذکورہ اسکول میں چند مسلمان ہیں۔ باقی سب کے سب غیر مسلم ہیں۔ یہاں بالکل لبرل ماحول ہے۔ مسلم اور غیر مسلم کشیدگی سے اس کا ماحول یکسر خالی ہے۔ اس فضا کی بنا پر یہاں مسلم طلبہ اور غیر مسلم طلبہ کی ملاقات بالکل فطری ماحول میں ہوتی ہے۔ ان کے درمیان دوری اور توحش کی دیوار حائل نہیں ہوتی۔ اس کا قدرتی نتیجہ وہ تاثر ہے جس کی مثال اوپر نقل کی گئی۔

معتدل ماحول میں یہ اختلاط (interaction) جو مذکورہ اسکول میں جزئی طور پر پایا جاتا ہے، یہی ماحول اگر پورے ملک میں اور ساری دنیا میں کلی طور پر پید ہو جائے تو اپنے آپ اسلام کی اشاعت ہونے لگے۔ اسلام چوں کہ غیر محرف مذہب ہے اور دوسرے مذاہب سب کے سب محرف مذہب، اس لئے محض سادہ تقابلی ہی لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ یہ تقابلی معتدل فضا میں پیش آیا ہو۔

## دو آیتیں

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ کافروں اور منافقوں کی طرف سے تم کو جو اذیت پہنچتی ہے، اس کو نظر انداز کرو (الاتزاب ۴۸) نبیوں پر ان کے مخاطبین نے تکلیفیں ڈالیں تو نبیوں نے ان سے کہا کہ تم ہم کو جو اذیت دے سبے ہو، اس پر ہم صبر کریں گے۔ (ابراہیم ۱۲)

ایک طرف قرآن میں زیادتیوں کے مقابلہ میں صبر و اعراض کا یہ حکم ہے، دوسری طرف اسی قرآن میں کہا گیا کہ اہل ایمان کو اجازت دی جاتی ہے کہ وہ ظلم کرنے والوں کے ساتھ جنگ کریں (الحج ۳۹) ان لوگوں سے اللہ کے راستہ میں جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ (التہور ۱۹)

یہ دونوں حکم بظاہر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ پھر ان میں تطبیق کیا ہے۔ ان میں تطبیق یہ ہے کہ دونوں کا عمل الگ الگ ہے۔ پہلا حکم ایک موقع کے لئے ہے اور دوسرا حکم دوسرے موقع کے لئے۔

اصل یہ ہے کہ مسلمان کی حیثیت ایک داعی گروہ کی ہے۔ اور دوسرے تمام لوگ ان کے لئے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان اصل نسبت یہی داعی اور مدعو کی نسبت ہے۔ اس نسبت کا تقاضا ہے کہ داعی اپنے مدعو کی زیادتیوں پر بیک طرفہ صبر کرے۔ اس صبر و اعراض کے بغیر داعی اور مدعو کے درمیان وہ معتدل فضا قائم نہیں ہو سکتی جو کسی نئے پیغام کو سننے اور اس کی طرف انھیں متوجہ کرنے کے لئے ضروری ہے۔

غیر مسلم قوموں کے مقابلہ میں اہل اسلام کو مستقل طور پر اسی پالیسی پر قائم ہونا ہے۔ انھیں غیر مسلموں کے برے سلوک کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے۔ دعوت کے مرحلہ میں اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

البتہ جب دعوت کا مرحلہ پورا ہو جائے اور غیر مسلم قوم کی طرف سے جارحانہ کارروائی کا آغاز کر دیا جائے تو اس وقت دفاع کے طور پر جنگ کی جاسکتی ہے۔ قرآن میں جنگ کی آیتیں اسی آخری صورت حال سے تعلق رکھتی ہیں۔

جنگ کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ دعوت کا عمل اپنی آخری حد پر پہنچ چکا ہو۔ تکمیل دعوت سے پہلے جنگ چھیڑنا مسلمان کے لئے جائز نہیں۔

## دعوت الی اللہ

مسلمان ختم نبوت کے بعد مقام نبوت پر ہیں۔ مسلمانوں کو پیغمبر کی نیابت میں وہی کام انجام دینا ہے جو پیغمبر نے اپنی زندگی میں براہ راست انجام دیا تھا (لیکون الرسول شہیداً علیکم وبتکونوا شہداء علی الناس)

یہ کام شہادت علی الناس اور دعوت الی اللہ ہے۔ اس سے مراد نہ حکومت اسلامی کا قیام ہے اور نہ حضرات اسلامی کا احیاء۔ اس کا مقصد تمام تر انداز و تہذیب ہے۔ اس کا نشانہ یہ ہے کہ خدا کے بندوں تک خدا کا پیغام اس حد تک پہنچ جائے کہ کسی کے لئے قیامت کے دن کوئی عذر باقی نہ رہے (رسلاً مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجة بعد الرسل)

اسلام میں حکومت اور اقتدار کی حیثیت شیئی آخر کی ہے۔ وہ امر مقصود نہیں ہے بلکہ وہ ایک امر موعود ہے (وعد اللہ الذین آمنوا و عملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض) اہل ایمان کو آخرت کے محرک کے تحت دعوت الی اللہ کا کام کرنا ہے۔ البتہ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اس عمل کے دوران ایسے حالات پیدا کر دے گا جو اہل ایمان کو ذیوی غلبہ تک پہنچانے والے ہوں۔

اللہ کی نصرت کے تمام وعدے عمل دعوت کی انجام دہی پر موقوف ہیں۔ اسی میں ملت اسلامیہ کی فوز و فلاح ہے۔ اسی میں عصمت من الناس کا راز چھپا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ امت محمدی کا امت محمدی ہونا عند اللہ اسی وقت تحقق ہوتا ہے جبکہ وہ دعوت الی اللہ کے اس کام کو انجام دے (المائدہ ۶۷)۔ اس کام کی صحیح ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کیا جائے۔ یہ رشتہ قائم کرنے کی ایک بھاری قیمت دینی لازمی ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان مدعو قوموں کی زیادتیوں اور ایذا پر یک طرفہ مبرا کریں۔ اس کے بغیر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا (ولنصبرن علی ما آذینا)۔

مسلمانوں کے جو قومی مسائل ہیں ان کے لئے کچھ لوگ علیحدہ پیٹ فارم بنا سکتے ہیں مگر اس طرح

کے امور کو دعوت کا عنوان دینا دعوت کی نشی کرنا ہے۔ ان مسائل کا حقیقی حل یہ نہیں ہے کہ ان کو دعوت کی فہرست میں شامل کر دیا جائے۔ اس کے بجائے ہم کو یہ یقین و اعتماد پیدا کرنا ہو گا کہ اگر ہم دعوت کا کام انجام دے دیں تو اس کے بعد ہمارے مسائل بھی لازمی طور پر حل ہو جائیں گے۔

مسلم ملکوں میں قانون اسلامی کے نفاذ یا غیر اسلامی حکمرانوں کے اخراج کے نام پر اسلامی جماعتوں اور قائم شدہ حکومت کے درمیان جو نزاع جاری ہے اس کو مکمل طور پر ختم کرنا ضروری ہے۔ اس جنگ کے نتیجے میں اسلامی تحریک غیر ضروری طور پر مسلم حکمرانوں کی حریف بن گئی ہے اور مسلم حکومتوں کا وہ تعاون اسلامی دعوت کے عمل کے لئے نہیں مل رہا ہے جو معتدل حالات میں ملنا یقینی تھا۔ مسلم ملکوں کے لئے صحیح اسلامی طریقہ کار یہ ہے کہ مسلم حکمرانوں سے سیاسی ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے ممکن مواقع کو دعوتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

### ضروری دعوتی پروگرام

۱ قرآن و حدیث اور سیرت کے ترجمے تمام زبانوں میں شائع کر کے عالمی سطح پر پھیلانا۔ یہ ترجمے صحیح اور معیاری زبان میں ہوں۔

۲ جدید عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر ہر زبان میں تیار کرنا اور ان کو وسیع پیمانہ پر پھیلانا۔ اس لٹریچر کو مثبت اور موضوعی انداز میں ہونا چاہئے۔

۳ ایسے اجتماعات منعقد کرنا جس میں غیر مسلموں کو بھی شریک کیا گیا ہو۔ ان اجتماعات میں صرف دعوتی کلام کیا جائے۔ اقوام عالم کی عداوتوں اور سازشوں پر شکایات و احتجاج سے آخری حد تک پرہیز کیا جائے۔

۴ ایسے ادارے کا قیام جہاں مسلم نوجوانوں کو دعوتی انداز میں تربیت دی جائے اور ان کو داعی کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لئے تیار کیا جائے۔

۵ دعوتی میدان میں کام کرنے والوں کا سالانہ یا اس سے کم مدت میں اجتماع کیا جائے تاکہ ایک کے مشورہ اور تجربہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچ سکے۔

۶ مسلمانوں میں دعوتی ذہن اور تعمیری طرز فکر پیدا کرنے کے لئے مستقل جرائم مختلف زبانوں میں جاری کرنا۔ ان جرائم کو ستر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کو ہر قسم کے غیر دعوتی مباحث سے یکسر پاک رکھا جائے۔

## داعی کا معاملہ

ایک فن کار اپنی ساری صلاحیت استعمال کر کے آرٹ کا ایک نمونہ تخلیق کرے اور ایک شخص اس کو لے کر آگ میں ڈال دے تو ایسا شخص فن کار کی نظر میں کتنا زیادہ مبغوض ہوگا۔ فن کار کی نظر میں اس کا وجود انتہائی حد تک قابل نفرت ہو جائے گا۔

ایک باغبان برسوں کی محنت سے پھول کا ایک درخت اگانے۔ پھر لمبے انتظار کے بعد اس کی شاخ پر ایک حسین پھول کھلے۔ اس وقت اگر ایک شخص آئے اور اس پھول کو توڑ کر اسے مسل ڈالے تو اس باغبان کی نظر میں وہ سخت زین مجرم ہوگا۔ باغبان چاہے گا کہ اس کو بھی وہ اسی طرح مسل ڈالے جس طرح اس نے اس کے حسین پھول کو سلا ہے۔

خدا کے داعی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ خدا کا داعی اگرچہ بظاہر ایک انسان ہوتا ہے۔ مگر وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کائنات کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ زمین و آسمان بے شمار گرجا و دھنیں کرتے ہیں تب قدرت کا وہ قیمتی آرٹ ظہور میں آتا ہے جس کو خدا کا داعی کہتے ہیں۔ سیکڑوں سال کے اندر بے شمار اسباب جمع ہوتے ہیں تب خدا کی زمین پر معنویت کا وہ پھول کھلتا ہے جس کا دوسرا نام خدا کا داعی ہے۔

ایسی حالت میں جو لوگ خدا کے داعی کے خلاف تحریک کاری کے منصوبے بنائیں وہ پوری کائنات کی ناقدری کرتے ہیں۔ وہ خدا کے خلاف سب سے زیادہ سنگین بناوت کرتے ہیں۔ وہ اس پھول کو مسنے کی کوشش کرتے ہیں جس کو خدا نے خود اگا یا ہے۔

خدا کی ضمانت ہے کہ ایسے لوگ اپنے منصوبہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے ناممکن ہے کہ وہ خدا کے داعی کو اس کے مشن کی تکمیل سے باز رکھ سکیں۔ خدا کا سچا داعی خدا کی خاص حفاظت کے سایہ میں رہتا ہے۔ اس کے لیے خدا کا ابدی فیصلہ ہے کہ وہ لازمی طور پر کامیاب ہو، اور اس کے دشمن لازمی طور پر ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں۔

خدا کے داعی کو زیر کرنا ایسا ہی ہے جیسے خدا کو زیر کرنا، اور کون ہے جو خدا کو زیر کرنے

کی طاقت رکھتا ہو (۱۷ جنوری ۱۹۸۶)

## پیغمبر کی پیشین گوئی

عن مرداس الاسلامی قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يذهب الصالحون الاقول فالاولى وتبقى حثالة كحثالة الشعير او القمل لا يبايهم الله باللة (رواه ابن ساری)

مرداس اسلمی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صالح لوگ چلے جائیں گے، ایک کے بعد ایک۔ اور پھر بھس رہ جائے گا، جیسے جوڑ یا کھجور کا بھس ہوتا ہے۔ اللہ کو ان کی کچھ پروا نہ ہوگی۔

اس حدیث میں ذہاب کا مطلب موت نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امت کے صالح افراد مر جائیں گے اور غیر صالح افراد زندہ رکھے جائیں گے۔ کیوں کہ موت تو سب کے اوپر یکساں طور پر آتی ہے۔ وہ صالح اور غیر صالح کے درمیان فرق نہیں کرتی۔

اس حدیث میں دراصل یہ بتایا گیا ہے کہ بعد کے زمانہ میں اسلامی اداروں اور اسلامی حلقوں کا یہ حال ہو جائے گا کہ وہاں عمومی طور پر وہ لوگ جمع ہوں گے جو پست ذوق اور معمولی صلاحیت والے ہیں۔ بلند صلاحیت والے اور اعلیٰ ذوق کے لوگ دینی شعبوں میں آنا کم ہو جائیں گے۔

خدا کا دین ایک ہی دین ہے۔ مگر نائننگی کے اعتبار سے اس میں فرق ہو جاتا ہے۔ دین کی نائننگی جب اعلیٰ سطح پر ہو تو اعلیٰ درجہ کے افراد اس کی طرف کھینچتے ہیں۔ اور جب دین کی نائننگی پست سطح پر ہونے لگے تو پست درجہ کے لوگ ہی اس کی طرف آتے ہیں۔

اداروں اور تحریکوں میں اگر اعلیٰ معیار کی تقریر اور تحریر کے ذریعہ دین کو پیش کیا جا رہا ہو تو اعلیٰ سطح کے افراد اس کی طرف کھینچیں گے۔ ان سے جس کردار کا مظاہرہ ہوگا وہ بھی اعلیٰ اور ارفع کردار ہوگا۔ اور جب دین پیش کرنے والوں کے یہاں تقریر و تحریر اور احسان و کردار کا معیار پست ہو جائے تو اسی درجہ کے لوگ دینی حلقوں میں جمع ہوں گے جو دین کی نائننگی کرنے والوں کا درجہ ہے۔

”اللہ کو ان کی پروا نہ ہوگی“ کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے ذریعہ دین کا کوئی بڑا کام نہیں انجام پا سکتا۔ بڑا کام کرنے کے لیے بڑا دل اور اعلیٰ صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ اور یہ چیزیں ان کے یہاں موجود نہ ہوں گی۔ ایسی حالت میں اس قسم کے لوگ کوئی بڑا دینی کام کس طرح انجام دے سکتے ہیں۔

## دعوت کا میدان

دوسری جنگ عظیم میں جرمنی اور جاپان ایک فوجی اتحاد میں شامل تھے جس کو محوری طاقتیں (Axis Powers) کہا جاتا تھا۔ ۱۹۴۰ میں اس اتحاد کا لغو ہوا تھا۔ آج یورپ، کل دنیا:

Today Europe, tomorrow the world

اس مقصد کے لئے جرمنی اور جاپان نے وہ خوفناک جنگ چھیڑی جس کو دوسری جنگ عظیم کہا جاتا ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ فوجی طاقت کے ذریعہ دنیا پر اپنی بالادستی قائم کرنے کا یہ منصوبہ سراسر ناکام رہا۔ تاہم جنگ میں ناکامی نے جرمنی اور جاپان کو سبق دیا۔ انھوں نے اپنے فوجی منصوبہ کو ترک کر کے اپنی ساری توجہ صنعتی اور اقتصادی منصوبوں پر لگادی۔ طریق عمل کی اس تبدیلی کا شاندار نتیجہ برآمد ہوا۔ خاموش عمل نے ان ملکوں کو اقتصادی ترقی کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیا۔ آج جرمنی اور خاص طور پر جاپان نے ساری دنیا میں صنعتی بالادستی کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ دنیا کے بازار ان کی صنعتی پیداواروں سے پٹے ہوئے ہیں۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لندن کا ایک ہفتہ وار میگزین "نیوسوسائٹی" (۵ فروری ۱۹۸۱) یہ معنی خیز جملہ لکھتا ہے کہ ان قوموں نے اپنے اس خواب کو اسن سے پورا کر لیا جو ان کو ۴۰ سال پہلے جنگ کے میدان میں لے گیا تھا:

They have fulfilled in peace the visions  
which took them to war 40 years ago.

جدید صنعتی قوموں کے اس واقعہ میں مسلمانوں کے لئے بہت بڑا سبق ہے، مسلمان پچھلے سو سال سے اپنے حریفوں کے مقابلہ میں سیاسی اور فوجی لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ ان لڑائیوں میں جان و مال کا اتنا زیادہ نقصان ہوا جس کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان کا کوئی فائدہ مسلمانوں کو نہیں ملا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اپنی جدید تاریخ پر نظر ثانی کریں اور اپنے طریق عمل کو بدل دیں۔ مسلمان کے پاس قرآن اور دین حق کی صورت میں اس سے زیادہ بڑی طاقت موجود ہے جس کو جرمنی اور جاپان نے سائنس اور نیکیانوجی کی صورت میں پایا ہے۔ مسلمان اگر سیاسی جنگاموں اور فوجی مقابلہ آرائیوں کو چھوڑ دیں اور اپنی ساری قوت دیگر اقوام میں اسلام کی اشاعت پر لگائیں تو یقینی طور پر وہ اپنے ان حوصلوں کی تکمیل کر سکتے ہیں جن کی تکمیل میں وہ اب تک ناکام رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان جس چیز کو «جنگ» کے میدان میں ناکام طور پر تلاش کر رہے ہیں وہ «دعوت» کے میدان میں کامیاب طور پر موجود ہے۔ بشرطیکہ وہ اس کو جانیں اور اس کو صحیح طور پر استعمال کریں۔

## عبادت گاہ

ڈاکٹر رالف سسن Ralph R. Sisson ایٹھٹ یونیورسٹی آف نیویارک (امریکہ) میں کیونٹی کیشن کے پروفیسر ہیں۔ ۲۷ جنوری ۱۹۸۹ کو ان سے اسلامی مرکز میں تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں میں نے انھیں اسلام کے تصور توحید، تصور رسالت اور تصور آخرت سے متعارف کیا۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ آپ ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے۔ کیا آپ چرچ جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے جاتا تھا، مگر اب نہیں جاتا۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ چرچ کے اندر بڑا عجیب ماحول ہوتا ہے۔ نقش و نگار، موسیقی، مختلف آوازیں اور طرح طرح کے رسمی اعمال۔ مجھ کو تو چرچ عبادت گاہ کے بجائے ایک کلب جیسا معلوم ہوتا ہے۔

It looks like a club, not a place of worship.

امریکی پروفیسر نے جو بات چرچ کے بارہ میں کہی، وہی تمام دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے لیے صحیح ہے۔ موجودہ زمانہ میں مذہبی بگاڑنے تمام دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کا ماحول ایسا بنا رکھا ہے کہ وہ عبادت گاہ کے بجائے کلب کے مشابہ ہو گئے ہیں۔ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے مقابلہ میں اسلامی مسجد انتہائی سادہ ہوتی ہے۔ اسلامی مسجدیں واقعی عبادت گاہ نظر آتی ہیں۔ جب کہ دوسری عبادت گاہیں اپنے ظاہری حلیہ کے اعتبار سے کلب دکھائی دیتی ہیں۔ مسجد کی اس سادگی اور ان کے اندر فطری عبادت کے ماحول نے ان مساجد کو ایک قسم کی زندہ تبلیغ بنا دیا ہے۔ ان کو دیکھنا بذات خود اپنے اندر ایک تاثیر ہی طاقت رکھتا ہے۔ مسجد اپنی ذات میں اسلام کی تبلیغ ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں دعوتی جذبہ نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی مسجدوں کے دروازے غیر مسلموں کے اوپر بند کر رکھے ہیں۔ اگر کسی تاریخی مسجد میں سیاتوں کو داخلہ کی اجازت ہو تو وہاں بھی نماز کے وقت انھیں باہر کر دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی مسجدوں کے دروازے غیر مسلموں کے لیے آزادانہ طور پر کھول دیں۔ یہ واقعہ انشاء اللہ غیر مسلموں کے دل کے دروازے کھولنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

## تے خون کی ضرورت

سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ - ۱۸۳۸) مسلمانوں کی اصلاح سے ابوس تھے۔ امیر شکیب ارسلان نے اس بارہ میں ان کے جو خیالات نقل کئے ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے:

قد فسدت اخلاق المسلمین الی انه لا امل بان یصحوا الا بان ینشأوا اخلاقاً جدیداً  
 وجیلاً مستأنفاً فحبذ الولد یبق منهم الا کل من هو دون الثانیة عشر من العمر فعند ذلک یتلقون ترویة جلیدة تسیرکم  
 مسلمانوں کے اخلاق اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ امید نہیں کہ ان کی اصلاح ہو۔ الایہ کہ ان میں نئی نسل پیدا ہو۔ کیا ہی اچھا، موکہ بارہ سال کی عمر کے سوا ان کے سارے لوگ ختم ہو جائیں۔ پھر وہ نئی تربیت قبول کریں گے جو انہیں سلامتی کے طریقہ تک پہنچائے۔

فی طریق السلامة دماض العالم الاسلامی (۱۹۳۳، صفحہ ۲۹۰)

۲۳ دسمبر ۱۹۷۳ء کو دہلی (جمیہ بلڈنگ) میں میری ملاقات مولانا سید منت اللہ رحمانی (امیر شریعت بہار) سے ہوئی۔ ان سے میں نے بعض مصلحین کے مذکورہ بالا اثرات کا ذکر کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے ایک روایت بیان کی۔ یہ روایت میں نے اسی وقت ایک کاغذ پر خود ان کے اپنے قلم سے لکھوائی تھی۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ کاغذ ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اس میں مولانا رحمانی نے لکھا تھا:

”مولانا ابو الحسن محمد سجاد صاحب (۱۹۲۰ - ۱۸۸۳) نے مجھ سے کہا کہ ایک دفعہ مولانا محمد علی مونگیریؒ (۱۹۲۷ء) کی خدمت میں عرض کیا کہ خدا بہتر جانتا ہے کہ جہاں جاتا ہوں اخلاص کے ساتھ جاتا ہوں، لیکن جب تک رہتا ہوں، لوگ دین کی طرف مائل رہتے ہیں، اور وہاں سے جتنے کے بعد لوگ کبھی دین کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اخلاص کا تو اثر ہونا چاہیے۔ حضرت مونگیری نے جواب دیا کہ ”اللہ تعالیٰ بصر اور زمانہ میں اپنی کسی نہ کسی صفت کے ساتھ جلوہ گر رہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر القرون میں اپنی صفت ”ابادی“ کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ اور اس عہد میں اپنی صفت ”المسل“ کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس لئے نہ برایت دیر پا ہوتی ہے اور نہ اخلاص مؤثر! جس کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کا منصب ہدایت تھا، وہ گمراہ ہو رہے ہیں۔“

ڈاکٹر اقبال (۱۹۳۸-۱۸۷۷) کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو صداقت اور عدالت اور شجاعت کا سبق پڑھائیں اور انہیں دوبارہ امامت دنیا کے لئے تیار کریں۔ انہوں نے مسلمانوں کو جگانے کے لئے اپنے اشعار کو رجز کے طور پر استعمال کیا۔ وہ اپنی ان کوششوں کے نتائج کے بارہ میں بہت پر امید تھے۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

نہیں بے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساتی  
اقبال نے اپنی پوری زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر دی۔ مگر ان کی "بانگ درا" اور "ضرب کلیم" کا کوئی  
نتیجہ نہ نکلا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی استعداد کے بارہ میں وہ مایوس ہو گئے۔ انہوں نے آخری طور  
پر اپنا تجربہ ان الفاظ میں بیان کیا:

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں ڈھونڈ چکائیں موج موج دیکھ چکا صدف صدف  
یہیں حال موجودہ زمانہ کے اکثر مسلمین کا ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے مسلمانوں کو اپنی کوششوں  
کا مرکز بنایا۔ مگر ساری کوشش صرف کرنے کے بعد انہیں یہ تلخ احساس ہوا کہ مسلمانوں میں کوئی گہری  
اصلاح قبول کرنے کا مادہ ہی نہیں ہے۔

موجودہ مسلمانوں کی استعداد کے بارہ میں مذکورہ بالا اصحاب کا تجربہ بجانے خود صحیح ہے۔ مگر  
اس کی توجیہ کے بارہ میں ان کا بیان صحیح نہیں۔ یہ درست ہے کہ گنتی اور مقدار دونوں اعتبار سے  
موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو اٹھانے کی بے حساب کوششیں کی گئیں مگر ان کا کوئی بھی قابل ذکر نتیجہ برآمد  
نہیں ہوا۔ مگر اس کی وجہ وہ نہیں جو اوپر نقل کئے ہوئے بیانات میں ملتی ہے۔

پانی اگر کسی گڑھے میں ٹھہر جائے تو کچھ دنوں کے بعد اس میں ببلو پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر جو پانی  
چشمہ یا دریا کی صورت میں رواں ہو، وہ ہمیشہ تازہ اور فرحت بخش بنا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے  
کہ گڑھے کے پانی میں پرانے پانی کے ساتھ نیا پانی شامل ہو نا بند ہو جاتا ہے۔ جب کہ چشمہ یا دریا میں  
مسلح پرانے پانی میں نیا پانی آ کر شامل ہوتا رہتا ہے۔

اسی مثال سے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے معاملہ کو سمجھا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان ایک  
جانہ نسل گروہ بن کر ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کثافت پیدا ہو گئی ہے۔  
اب ضرورت ہے کہ ان کے اندر نیا خون (New blood) شامل کیا جائے۔ ان کے پرانے پانی

میں نیا پانی ملا کر انہیں رواں دریا بنا دیا جائے۔ اس کے بعد ان کی کثافت اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔ دعوت کا عمل اسی مقصد کو پورا کرتا ہے۔ دعوت کے ذریعہ دوسری قوموں سے نئے اور جاندار افراد اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی صف میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح بار بار نئے خون کے لئے سے مسلمانوں میں زندگی باقی رہتی ہے۔ مگر صدیوں سے مسلمانوں میں دعوتی عمل بند ہے۔ ان کے پرانے خون میں نیا خون آکر شامل نہیں ہو رہا ہے۔ یہی اصل وجہ ہے اس صورت حال کی جس کا ذکر اوپر چند اسباب کے حوالے سے کیا گیا۔

دعوت الی اللہ کا کام مسلمانوں کے لئے بیک وقت دو فائدوں کا حامل ہے۔ ایک طرف وہ امت محمدی کی حیثیت سے اپنی عمومی ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی عمل اس بات کا ضامن بھی ہے کہ مسلمان ہمیشہ ایک زندہ اور طاقت ور قوم بنے رہیں۔

## سیاست، دعوت

پاکستان کی ایک خاتون بیگم شائستہ اکرام اللہ (۵۷ سال) کا مضمون انگریزی ماہنامہ ریڈرس ڈائجسٹ کے شمارہ مئی ۱۹۹۱ میں چھپا ہے۔ وہ تقسیم سے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک سرگرم کارکن تھیں۔ تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۴ تک وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی ممبر رہیں۔ ۱۹۶۳ سے ۱۹۶۷ تک وہ مراکو میں پاکستان کی سفیر تھیں۔ مذکورہ مضمون کا عنوان ہے: "محمد علی جناح! اس مضمون میں انھوں نے مسٹر محمد علی جناح کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ پٹوارہ سے پہلے ۱۹۴۵ میں پیش آیا۔ وہ لکھتی ہیں:

I'd been invited by the government to represent India at an international peace conference in San Francisco, but the leader of our political party was telling me I shouldn't go. His reason: our party, the All-India Muslim League, was committed to non-cooperation with India's British rulers: as a disciplined Leaguer, I could not be part of a government delegation. I was tempted to go, so I said, "Can't I go and not talk politics?" "Then what will you talk about?" Mohammed Ali Jinnah asked sharply. "The man in the moon?" His face softened. "I know how disappointed you are," he said, "but a principle is at stake. One day, I promise, you will go to an international conference — and with honour, representing your country." That encounter took place in 1945, but even today the wonder of it moves me.

Reader's Digest, New Delhi, May 1991, pp. 29-30

برٹش گورنمنٹ کی طرف سے مجھے یہ دعوت دی گئی تھی کہ میں سان فرانسسکو میں ہونے والی ایک بین الاقوامی امن کانفرنس میں ہندستان کی نمائندگی کروں۔ مگر ہماری سیاسی پارٹی کے قائد نے مجھ سے کہا کہ مجھ کو اس کانفرنس میں نہیں جانا چاہیے۔ ان کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری پارٹی، آل انڈیا مسلم لیگ، اس کی پابند ہے کہ وہ ہندستان کے برٹش حکمرانوں سے تعاون نہیں کرے گی۔ لیگ کی ایک باضابطہ فرد کی حیثیت سے مجھ کو ایک سرکاری وفد کا حصہ نہیں بننا چاہئے۔ میں اس کانفرنس میں جانے کی طرف راغب تھی۔ اس لئے میں نے کہا کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں جاؤں مگر وہاں میں سیاست کی بات نہ کروں۔ محمد علی جناح نے تیزی سے پوچھا کہ پھر اور کون سی بات تم وہاں کرو گی۔ کیا چاند پر انسان کے بارہ میں۔ اس کے بعد انھوں نے نرمی کے ساتھ کہا کہ میں

جانتا ہوں کہ اس سے تم کو کتنی زیادہ مایوسی ہوگی۔ مگر یہاں ایک اصول خطہ میں ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک دن تم ایک بین الاقوامی کانفرنس میں جاؤ گی اور عزت و وقار کے ساتھ اپنے ملک کی نمائندگی کرو گی۔ مسز جناح کے ساتھ میرا یہ سامنا ۱۹۴۵ میں ہوا تھا، مگر آج بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میرے اوپر اس کا عجیب تاثر ہوتا ہے۔

مذکورہ بین الاقوامی کانفرنس امن کے موضوع پر ہو رہی تھی۔ یہاں موقع تھا کہ عالمی شخصیتوں کے سامنے اسلام کی امن سے متعلق تعلیمات پیش کی جائیں۔ اس عالمی ایٹیج کو اسلام کے تعمیری پیغام کے اعلان کے لئے استعمال کیا جائے۔ مگر مسز محمد علی جناح کے ذہن پر سیاست کا اتنا غلبہ تھا کہ انہیں اس کے سوا کوئی اور قابل ذکر بات معلوم ہی نہ تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک عالمی کانفرنس میں اگر سیاست کی بات نہ کہنا ہو تو پھر اور کون سی بات ہے جو وہاں کہی جائے گی۔

تاہم یہ صرف مسز جناح کا معاملہ نہیں، یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلم قائدین کا معاملہ ہے جو وہ زمانہ کے ہر مسلم قائد کا یہ حال ہوا کہ وہ سیاسی تحریک کے تحت اٹھا۔ اس کی پوری سوچ سیاسی رخ پر چل رہی تھی۔ اس لئے اس کو سیاست کے سوا کوئی اور کرنے کا کام معلوم ہی نہ تھا۔ ہر ایک بس سیاست کے میدان میں اپنی سرگرمیاں دکھاتا رہا۔ سیاست کے باہر اس کو کوئی کام نظر نہ آیا جس میں وہ اپنے کو یا اپنے ساتھیوں کو مصروف کرے۔

دور جدید کے انقلاب نے ہمارے لئے جو سب سے بڑا میدان کھولا وہ اسلامی دعوت کا میدان تھا۔ اس دور میں پہلی بار مذہب پر آزادانہ غور و فکر کی فضا پیدا ہوئی۔ جدید حالات نے اس کو ممکن بنایا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے اہتمام میں مذہبی اور روحانی کانفرنس کریں۔ اور دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کے نمائندوں کو بھی دعوت دیں کہ آپ وہاں آکر اسلام کی تعلیمات پیش کریں۔ جدید مواصلاتی ذرائع نے سفر کو اور پیغام رسانی کے عمل کو بے حد آسان بنا دیا۔

مزید یہ کہ موجودہ زمانہ میں پہلی بار مذاہب کی آزادانہ تحقیق کی گئی۔ اس تحقیق نے خالص علمی اور تاریخی طور پر یہ ثابت کیا کہ تمام مذاہب غیر معتبر ہیں۔ مذاہب کی فہرست میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو علمی طور پر ثابت شدہ اور تاریخی طور پر قابل اعتبار ہے۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کو یہ کرنا تھا کہ وہ ہر دوسرے مسئلہ کو نظر انداز کر کے اسلام کے

پیغامِ رحمت کو تمام قوموں تک پہنچائیں۔ مگر مسلمانوں نے اس کے بالکل برعکس عمل کیا۔ انہوں نے اسلام کی پیغامِ رسانی کے کام کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ اور نام نہاد سیاسی جہاد میں ہر تن مشغول ہو گئے۔ حتیٰ کہ ان کا یہ حال ہو گا کہ ان کے بڑے بڑے رہنماؤں تک کو شعور کے درجہ میں بھی اس کا احساس نہ رہا کہ اسلام کی دعوت بھی کوئی کام ہے جس کے لئے انھیں دوسری قوموں کے درمیان متحرک ہونا پڑا ہے۔ آج کوئی مسلم جماعت تو درکنار، پوری مسلم دنیا میں کوئی قابل ذکر فرد بھی نہیں جس کو حقیقی طور پر دعوت الی اللہ کا شعور ہو، اور وہ اس اہم ترین کام میں فی الواقع اپنے آپ کو لگائے ہوئے ہو۔

حضرت یونس علیہ السلام سے دعوت الی اللہ کے معاملہ میں جزئی اور اجتہادی کوتاہی ہوئی تھی۔ اس کے نتیجہ میں وہ مچھلی کے پیٹ میں ڈال دئے گئے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے یہی کوتاہی مکمل طور پر اور بدترین طور پر کی ہے۔ یہ بلاشبہ اللہ کی ناراضگی کی بات ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں پوری ملت مسلم مسائل کے پیٹ میں ڈال دی گئی۔ مسائل کی پھیلی نے ان کو ننگل رکھا ہے۔ یہ حالت کسی ایک ملک کی نہیں۔ ہندوستان، پاکستان، بلاد عربیہ، اور دوسرے تمام علاقوں کے مسلمان مسائل کے شکار ہیں گرفتار ہیں۔ ان کی ہر کوشش اس کی شدت میں اضافہ کر رہی ہے، وہ اس میں کوئی کمی نہیں کرتی۔

”مسائل کی پھیلی“ کے پیٹ سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے۔ مسلمان اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ وہ اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ وہ دوسری قوموں کو حریف اور رقیب سمجھنے کا مزاج ختم کریں۔ وہ ان سے مدعو و الامسأله کریں۔ وہ ان کے اوپر دعوت الی اللہ کی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ یہی مسائل کے پیٹ سے نکلنے کا واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا راستہ نہیں جو انھیں اس گرفتاری سے نجات دینے والا ہو۔

## مسجد

” ہمارا مقصد مسجد والے اعمال کو زندہ کرنا ہے“ تبلیغی جماعت کے لوگ جب یہ بات کہتے ہیں تو عام لوگوں کو بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی بات ہے، بلکہ یہی سب سے بڑی بات ہے۔ ”مسجد والے اعمال“ کو اگر کسی جامعہ میں نہ لیا جائے تو اس میں دین کی ساری حقیقت آجاتی ہے۔

مسجد والے اعمال کیا ہیں۔ مسجد والے اعمال یہ ہیں کہ آدمی کے اندر دینی شعور پیدا کیا جائے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھنے تو انسانی شعور ہی انسانی عمل کی بنیاد ہے۔ انسان کا خارجی عمل اس کے اندرونی شعور ہی کا خارجی نلبور ہوتا ہے۔ مسجد اسی ربانی شعور کی تعمیر کا مرکز ہے۔ اسی طرح ہر آدمی کا کوئی شعوری مرکز ہوتا ہے۔ ہر آدمی گویا کسی نہ کسی ”مسجد“ پر کھڑا ہوا ہے۔ دوسرے لوگ غیر خدائی مسجد پر کھڑے ہوتے ہیں۔ مسلمان وہ ہے جو خدائی مسجد کے اوپر اپنے آپ کو کھڑا کرے۔

ایک سیاح جس نے دنیا کے اکثر حصوں کا سفر کیا ہے، لکھتا ہے کہ مختلف ملکوں کے سفر کے دوران میں نے ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ غیر مسلم ملکوں میں ہر جگہ قدیم زمانہ کے بڑے بڑے قلعے کھڑے ہوئے ہیں۔ جب کہ مسلم دنیا میں اس قسم کے مناظر بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ ہر مسلم شہر میں عایشان مسجدیں ضرور ہیں جن کے اونچے مینار دور سے ان کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ غیر مسلم ملکوں کی نمایاں عمارتیں اگر ان کے قلعے ہیں تو مسلم ملکوں کی نمایاں عمارتیں ان کی مسجدیں۔

یہ فرق دونوں قسم کے لوگوں کے مزاج کا پتہ دیتا ہے۔ غیر مسلم قوموں کا اعتماد مادی اسباب پر تھا، اس لئے انھوں نے قلعے اور حصار کھڑے کئے۔ اس کے برعکس مسلم قوموں کے عقیدہ کے مطابق ان کا اعتماد اللہ پر تھا۔ اس لئے وہ جہاں بیٹھے، انھوں نے بڑی بڑی مسجدیں بنائیں۔

مسجد۔ محمد و دعوئوں میں، صرف عبادت گھر نہیں، وہ اسلام کے حق میں خدائی قلعہ ہے۔ مسجدیں اسلامی دنیا کی نگہبان ہیں۔ مسجد کے ذریعہ اسلام اپنی حیثیت کو زمین پر قائم کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے وہ دلوں کو سخر کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد قائم ہوتا ہے ایک حدیث میں مسجد کو اللہ سے ڈرنے والوں کا گھر کہا گیا ہے (المساجد بیوت المتقین)

مسجد خدا کا گھر ہے۔ مسجد میں خدائی اعمال کے ذریعہ ایک ایسا ماحول پیدا کیا جاتا ہے جہاں آپ کو اپنے رب کی چھاؤں میں محسوس کریں۔ وہاں سے دینی معرفت کی غذائے کرباہر کی دنیا کی طرف لوٹیں۔ خود اسلام پر قائم ہوں اور دوسرے ہند گمان خدا کو اسلام پر قائم رکھنے کی کوشش کریں۔

مسجد ایک قسم کا دارالاسلام ہے۔ وہ اللہ کی یاد کی جگہ ہے۔ وہ اسلامی اتحاد کی تربیت گاہ ہے۔ وہ مسلمانوں کے اعتماد علی اللہ کا نشان ہے۔ وہ اسلام کی دعوتی اور اصلاحی سرگرمیوں کا مرکز ہے جب اسلام زندہ تھا تو سبھی صرف مسجد نہ تھی بلکہ وہاں اسلامی زندگی کے تمام شعبے قائم ہوتے تھے۔ مثلاً عبادت گاہ، مدرسہ، دارالتقضاء، اجتماع گاہ، اسپتال، کتب خانہ، مسافر خانہ، مقام شادرت اصلاحی و تبلیغی مرکز وغیرہ۔

مصر میں جب بنی اسرائیل کے لئے زمین تنگ ہو گئی تو حکم ہوا کہ اپنے گھروں کو مسجد بنا لو (یونس - ۸۷) اس سے معلوم ہوا کہ حالات جب اہل ایمان کو پسپا کرتے کرتے ان کو آخری جگہ پناہ (گھر) تک پہنچادیں تو اس وقت ان کا گھر ہی جدوجہد کا میدان بن جاتا ہے۔ وہ اپنے گھروں کو مسجد کی صورت دے کر وہاں اپنے کو صبر و نماز کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں۔ وہ اعتماد علی اللہ اور تعلق مع اللہ میں اپنا مستقبل تلاش کرنے لگتے ہیں۔ مسجد اہل ایمان کے لئے صرف درود یو اور کا مجموعہ نہیں۔ وہ اپنے رب سے لپٹنے کے لئے تنہائی کا ماحول ہے۔ اور اللہ پر بھروسہ کا مزاج پیدا کرنے کے لئے مقام تربیت ہے۔ ”مسجد اس بات کا نشان ہے کہ اہل ایمان کا قافلہ خواہ کتنا ہی پیچھے دھکیل دیا جائے، اس کے لئے ہر حال میں ایک نئے سفر کا نقطہ آغاز موجود رہتا ہے۔ اس آخری قلوہ کو کسی حال میں کوئی ان سے چھین نہیں سکتا۔“

اسی کے ساتھ مسجد کا ایک عمل اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ مسجد کی دنیا میں خدا پرستی اور آخرت پسندی کا ماحول پیدا کر کے دوسری قوموں کے افراد کو متوجع دیا جائے کہ وہ یہاں آکر اسلام کا مطالعہ و مشاہدہ کریں۔ اور اس بات سے آگاہی حاصل کریں کہ ان کے رب کی مرضی ان کے بارہ میں کیا ہے اور نبوت کے بعد خدا کی عدالت میں ان کے کس قسم کا سوال کیا جانے والا ہے۔ مسجد کی یہ دعوتی اور تبلیغی حیثیت قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

”اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تجھ سے امان کا طالب ہو تو اس کو اپنے پاس آنے دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے۔ پھر اس کو اس کے ٹھکانے تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے (توبہ ۶) معلوم ہو کہ اسلام کا گھر، مسلمانوں کے لئے عبادت اور اصلاح کا مقام ہونے کے ساتھ، دوسری قوموں تک خدا کا پیغام پہنچانے کا مرکز بھی ہے۔ جس طرح اسلام کے سمنے کی جگہ ہے، اسی طرح وہ اسلام کے پھیلنے کا نقطہ بھی ہے۔ یہاں خدا کا دین استقام حاصل کرتا ہے اور یہیں سے وہ اپنے سفر کو بھی جاری کرتا ہے۔ یہ اسلام کا سمندر بھی ہے اور اس کا بحاب اٹھنے کا مقام بھی۔

مسجد کے اندر تبلیغ کی تاثیر اور تبلیغ کی عظمت تاریخ سے ثابت ہے۔ مغل قبائل نے تیرھویں صدی عیسوی میں مشرق کی جانب سے عالم اسلام پر حملہ کیا، اور اس کے بڑے حصہ میں اسلام کے نشانات کو مٹا ڈالا۔ مگر اسلام کے انھیں گھنڈروں سے اسلام دوبارہ ایک تسخیری طاقت بن کر ابھرا۔ مغلوں نے اسلام قبول کر لیا۔ وہی مسجدیں جن کو ہلا کو نے سمرقند سے حلب تک اپنے راستہ میں تباہ کر دیا تھا، اس کے پوتوں نے دوبارہ ان مسجدوں کی تعمیر کی اور ان کی چیمتوں کے نیچے خدانے واحد کے آگے سجدہ کیا۔

آج اسلام کو جو بیخ و درپیش ہے، اس کے جواب کی صورت یہ ہے کہ مسجد کو اس کے پورے معنیوں میں زندہ کیا جائے۔ ایک عرب عالم و کتور حسین مونس کے یہ الفاظ نہایت صحیح ہیں :

ان الاسلام اليوم يخوض معركة آج اسلام کو ایک جنگ کا سامنا ہے اور اس والمساجد من اہم اسلحتنا فیہا میں مسجدیں ہمارا انہایت اہم ہتھیار ہیں۔

انجیل اسلامی (کویت)، رجب ۱۳۹۳ھ، صفر ۶۔

## عمل، رد عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے تلاشِ حق میں بے چین رہتے تھے۔ یہاں تک کہ غار حرا میں خدا کا فرشتہ ظاہر ہوا، اس نے خدا کی طرف سے یہ حکم سنایا کہ 'اقرأ' (پڑھ) کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے "علم" کے ذریعہ انسانوں کی رہنمائی کا سامان کیا ہے 'علم بالقلم علم الانسان ما لم يعلم' (یہ واقعہ جو اپنی مخصوص صورت میں پیغمبرانہ سطح پر پیش آیا، یہی دوسروں سے بھی غیر پیغمبرانہ سطح پر مطلب ہے۔ آج بھی ضرورت ہے کہ کوئی بندہ خدا حق و صداقت کی جستجو میں بے چین ہو اور پھر اس کو غیبی آواز پکار کر کہے کہ "پڑھ"۔ وہ اس پکار کی اتباع میں قرآن اور حدیث اور سیرت اور صحابہ کی زندگیوں کا گہرا مطالعہ کرے۔ اس مطالعہ کے بعد اس پر کلمے کا امر حق کیا ہے۔ وہ اس کو لے اور اس کی روشنی میں لوگوں کو رہنمائی دینا شروع کرے۔

مگر موجودہ زمانہ میں جو مفکر اور رہنما اٹھتے، ان میں سے کوئی بھی نہیں جو ان مراعل سے گزر رہو۔ ہر ایک کا یہ حال ہوا کہ مسلم سلطنت کے زوال کے بعد پیدا ہونے والے حالات کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔ اور مسلمانوں کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی مغلوبیت ختم کرنے کے لیے "جہاد" کرنے لگا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ رد عمل سمجھنا کہ عمل۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اٹھنے والے مفکرین اور رہنماؤں میں سے کوئی نہیں جو اسلام کی صحیح تشریح کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔ ان کی رد عمل کی نفسیات نے انھیں اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف محاذ آرائی کی طرف مائل کر دیا۔ جس کو وہ غلطی سے جہاد کہتے رہے۔

یہ معن کرین اگر مذکورہ پیغمبرانہ انداز میں اٹھتے تو ان کے اندر داعیانہ فکر ابھرتا، جیسا کہ پیغمبر کے اندر "حرار" کے تجربہ کے بعد ابھرا۔ مگر ان کی رد عمل کی نفسیات کی بنا پر ان کے اندر صرف مہاجرانہ (ڑائی بھڑائی) کا ذہن ابھر آیا۔ ان رہنماؤں کی پرشور تحریکیں ملت کو کوئی مثبت فائدہ نہ پہنچا سکیں۔ البتہ ان کا نقصان یہ ہوا کہ پوری ملت کا ذہن خراب ہو گیا۔ مسلمان داعیانہ طرز فکر سے خالی ہو کر جنگ جویانہ طرز فکر پر قائم ہو گئے۔

موجودہ ملت مسلمہ کا بلاشبہ یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

## تعلیم، تحریک

علی گڑھ کالج، موجودہ مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک مسلمان نے اپنے لڑکے کو تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجا۔ روانگی سے قبل انھوں نے اپنے صاحبزادے کو جو ضروری ہدایات دیں، ان میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ "دیکھو، رائڈنگ کلب کے گھوڑے پر وضو کے بغیر سوار نہ ہوتا"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ میں علی گڑھ کے بارہ میں مسلمانوں کے جذبات کیا تھے۔ وہ لاکھوں کو گھوڑے پر چڑھاتے ہوئے "بسم اللہ" اور "وضو" کی تاکید کرتے تھے۔ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ علی گڑھ میں وہ مسلم نسل تیار نہ ہو سکی جو دور جدید کی شہ سوار بن سکتی اور جدید چیلنج کا مقابلہ کر کے اسلام کو دوبارہ اس بلند مقام پر بھٹائی جو دینِ فطرت ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے ابدی طور پر مقدر کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے انسان تحریک سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ تقسیم سے۔ تعلیم گاہ میں صرف زبان اور علوم سکھائے جاتے ہیں۔ وہاں پروفیشنل سرٹیفیکٹ دیئے جاتے ہیں۔ اور ایک تعلیم گاہ کے ذریعہ صرف اتنا ہی ہو سکتا ہے۔ تعلیم گاہ آدمی کو واقف کار بنا سکتی ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ لکھنے اور پڑھنے لگے۔ مگر فکری انقلاب اور مقصدی حرکت اس سے الگ ایک چیز ہے، اور وہ کسی تعلیم گاہ کے ذریعہ کبھی پیدا نہیں کی جاسکتی۔

خود علی گڑھ میں اس کی ایک عملی مثال موجود ہے۔ طلبہ کے سرپرستوں کی مذکورہ تمناؤں یا یونیورسٹی میں تھیالوجی کے شعبے سے وہاں کے طلبہ میں کبھی دینداری نہ آسکی۔ مگر موجودہ زمانہ میں جب تبلیغی جماعت نے وہاں دعوتی اور تحریکی انداز میں محنت کی تو بہت سے طلبہ میں دینداری پیدا ہو گئی۔

ضرورت ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم کے ساتھ تحریک کا اظہار کیا جائے۔ تحریک سے میری مراد طلبہ کی یونین نہیں ہے۔ وہ تو میرے نزدیک صرف بگاڑ پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ میری مراد ایک ایسی تحریک سے ہے جو عملی طور پر غیر سیاسی انداز کی ہو اور وقت کے فکری معیار پر اسلامی دعوت کا کام کرے۔ یہی تحریکی عمل اس بات کا ضامن ہوگا کہ علی گڑھ میں صرف ڈگری بولڈر پیدا نہ ہوں بلکہ وہاں سے وہ انقلابی انسان تیار ہو کر نکلیں جو اسلام کی نئی تاریخ بناسکیں۔

## قرآن کا ترجمہ

۵ جنوری ۱۹۸۳ کا واقعہ ہے۔ میں افریقہ کے ایک سفر سے دہلی واپس آ رہا تھا۔ روم میں ایک مستشرق ہمارے جہاز میں سوار ہوئے اور میری سیٹ کی بغل والی سیٹ پر بیٹھے۔ ان کا ذکر میں نے اپنے سفر نامہ مطبوعہ الرسالہ نومبر ۱۹۸۳ میں کیا ہے۔ اس مستشرق کا نام ویتہ حسب ذیل ہے۔

Dr. J. Oacek, Oriental Department,  
Charles University, Prague, Czechoslovakia.

چیکو سلاواکیا کے اس مستشرق نے گفتگو کے دوران بتایا کہ چیکو سلاواکیا کے ایک مستشرق نے قرآن کا ترجمہ چیک زبان میں کیا ہے۔ یہ ترجمہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ ترجمہ بہت اچھا ہے۔ وہ جب چھپ کر بازار میں آیا تو چند ہفت کے اندر اس کے تمام نسخے فروخت ہو گئے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں دعوت اسلام کے کتنے زیادہ مواقع ہیں۔ آج ساری دنیا میں بے شمار لوگ ہیں جو اسلام کا مطالعہ اس کے اصل اور براہ راست ذرائع سے کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی مطلوبہ کتابیں ابھی ان کو بہت کم فراہم کی جاسکتی ہیں۔ خاص طور پر ضرورت ہے کہ قرآن کا ترجمہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی زبان میں کیا جائے اور اس کو چھاپ کر بڑے پیمانہ پر ساری دنیا میں پھیلا دیا جائے۔

مگر مسلمانوں کو ابھی اس کام سے بہت کم رغبت ہو سکتی ہے۔ جنوبی ہند کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے مجھ سے کہا کہ میرے ایک عیسائی دوست نے قرآن کا ایک ترجمہ خریدا۔ اس کے بعد جب اس عیسائی دوست سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ آپ لوگ عیسائیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مجھے قرآن کے ترجمہ کی ضرورت تھی تو وہ مشکل سے مجھے اتنی قیمت پر ملا۔ اس کے برعکس عیسائیوں کا یہ حال ہے کہ اگر میں ٹیلی فون کروں کہ مجھے مفت تقسیم کے لئے انجیل کی ضرورت ہے تو چند گھنٹہ کے اندر پانچ ہزار نئے میرے دفتر میں آ جائیں گے۔

سعودی عرب اور بعض دوسرے مسلم ممالک نے موجودہ زمانہ میں یہ اہتمام کیا ہے کہ وہ قرآن کے ترجمے چھاپ کر پھیلائے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہ کوششیں اصل ضرورت کے مقابلہ میں ابھی بہت کم ہیں۔ اور ان کا ترجمہ بھی پوری طرح قابل اعتماد نہیں۔

مسلمان سچے دین کے حامل ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ خدا کے دین کو اس کے تمام ہندوں تک پہنچائیں۔ مگر یہ بھی وہ کام ہے جس سے آج مسلمان سب سے زیادہ دور ہو رہے ہیں۔

## داعیانہ عمل، داعیانہ رویہ

ایک دکان دار وہ ہے جو دکان کھولنے کے بعد ہر طرف اس کا اعلان بھی کرے۔ اخبار، ریڈیو، ٹیلی ڈرن اور دوسرے ذرائع ابلاغ کو استعمال کر کے اس کو پوری آبادی میں مشہور کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرا دکان دار وہ ہے جو دکان کھولنے کے بعد اس کا اشتہار تو نہ کرے، البتہ اپنی دکان میں دکاندار کی طرح رہے۔ وہ اپنی دکان میں صحیح سامان رکھے، لوگوں سے میٹھا بول بولے۔ لین دین میں کسی کو شکایت کا موقع نہ دے۔ پہلا دکان دار بلاشبہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا۔ وہ اپنی تجارت کو تیسری تجارت بنا دے گا۔ مگر دوسرا دکان دار بھی اپنی تجارت کو نفع بخش بنانے میں کامیاب رہے گا۔ پہلا دکان دار اگر "کروروں" روپیہ کمائے گا تو دوسرا دکان دار بھی "لاکھوں" روپیہ حاصل کر لے گا۔ پہلے اور دوسرے میں صرف مقدار کا فرق ہو گا نہ کہ نوعیت کا۔ اسی مثال سے اسلام اور مسلمانوں کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان پورے معنوں میں داعی بن کر رہیں۔ وہ منصوبہ بند انداز میں دوسری قوموں تک اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ وہ دین اسلام کے باقاعدہ مبلغ بن جائیں۔ اگر مسلمان ایسا کریں تو یہ ان کے لیے بہت بڑے فضل کی بات ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو کسی گروہ کو دنیا اور آخرت میں سب سے بڑے انعام کا مستحق بنا تا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمان باقاعدہ اور براہ راست انداز میں دعوتی جدوجہد نہ کریں۔ تاہم وہ اپنی ذاتی اور جماعتی زندگی میں داعیانہ رویہ اختیار کریں۔ وہ دوسری قوموں کو تحریف سمجھنے کے بجائے مدعو سمجھیں۔ وہ اللہ سے لوگوں کی ہدایت کے طالب ہوں۔ غیر مسلم افراد سے تعلقات کے دوران اسلامی اخلاق کا لحاظ رکھیں۔ غیر مسلموں کی طرف سے زیادتی کا تجربہ ہو تو اس کو برداشت کر لیں۔ ہر اس کارروائی سے اپنے آپ کو بچائیں جو غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان کھینچاؤ اور نفرت پیدا کرنے والی ہو۔ مسلمان اگر یہ دوسرا رویہ اختیار کریں تب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں رحمت اور انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔

اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ باقاعدہ اور منظم انداز میں تبلیغ کا کام زیادہ تر مکہ کے ۱۳ سالہ دور میں ہوا۔ تاہم اسلام برزنامہ میں تیزی سے پھیلتا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ براہ راست داعیانہ عمل نہ کریں، تاہم وہ داعیانہ رویہ پر ہمیشہ قائم رہے۔ یہی خاص سبب ہے جس کی بنا پر اسلام کے پھیلنے کا سلسلہ تاریخ کے ہر دور میں رکنے بیغیر جاری رہا۔

## دلیل کی سطح پر

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کا مضمون کھول کھول کر بیان کیا ہے، پھر بھی اکثر لوگ انکار ہی کیے جا رہے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین سے کوئی چیز نہ جاری نہ کرو یا تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو جائے۔ پھر تم اس باغ کے بیج میں خوب نہریں جاری کر دو۔ یا جیسا کہ تم کہتے ہو، ہمارے اوپر آسمان سے ٹکڑے گرا دو یا اللہ اور فرشتوں کو لا کر ہمارے سامنے کھڑا کر دو یا تمہارے پاس سونے کا کوئی گھر ہو جائے۔ یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے چڑھنے کو بھی نہ مانتیں گے جب تک تم وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتار دو جس کو ہم پڑھیں۔ کہو کہ میرا رب پاک ہے، میں تو صرف ایک بشر ہوں، اللہ کا رسول۔ اور جب ان کے پاس ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے سے اس کے سوا کوئی اور چیز مانع نہیں ہوئی کہ انہوں نے کہا کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کہو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے کہ وہ اس میں چلتے پھرتے تو البتہ ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔ کہو کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے، بے شک وہ اپنے بندوں کو جاننے والا، دیکھنے والا ہے۔ اللہ جس کو راہ دکھائے وہی راہ پلنے والا ہے۔ اور جس کو وہ بے راہ کر دے تو تم ان کے لیے اللہ کے سوا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے۔ اور ہم قیامت کے دن ان کو ان کے منہ کے بل اندھے اور گونگے اور بہرے اکٹھا کریں گے۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے (جنی اسرائیل ۸۹ - ۹۰)

ہر زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ لوگوں نے حق کے داعی کی بات کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی حق کا داعی اٹھتا ہے تو بظاہر وہ صرف ایک "بشر" ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ تاریخی عظمتیں جمع نہیں ہوتیں۔ اس لیے لوگ اس کو ایک عام آدمی سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

حق ہمیشہ دلیل کی سطح پر ظاہر ہوتا ہے نہ کہ ظاہری عظمتوں کی سطح پر۔ جو لوگ حق کو دلیل کی سطح پر نہ پائیں وہ اللہ کی نظر میں اندھے اور بہرے ہیں۔ آخرت میں ان کی اندرونی حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ وہاں وہ اس حال میں اٹھیں گے کہ وہ آنکھ رکھتے ہوئے اندھے ہوں گے اور کان رکھتے ہوئے بہرے۔

## چالیس سال بعد

نکولاجاؤسکو (Nicolae Ceausescu) رومانیہ کا کیونٹ لیڈر تھا۔ ۱۹۴۸ میں وہ رومانیہ کا وزیر زراعت بنا۔ اس کے بعد وہ ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۷ میں وہ رومانیہ کا صدر بن گیا۔ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے اس نے ہر ممکن کارروائی کی۔ اسی میں یہ تھا کہ اس نے اپنی بیوی ایلینا (Elena) کو نائب صدر بنایا اور میٹر کلیدی عہدوں پر اپنے رشتہ داروں کو بٹھا دیا

چاؤسکو نے طاقت کے ذریعہ اپنے تمام مخالفین کو کچل دیا۔ رومانیہ کے مشہور شاعر اینڈریو پائونیو کے ذریعہ اس نے ایک نظم تیار کرائی جو ”نغمہ رومانیہ“ کہی جاتی تھی۔ اس میں چاؤسکو کو ”رومانوی قوم کا سب سے زیادہ محبوب فرزند“ قرار دیا گیا تھا۔ یہ نظم روزانہ مختلف مواقع پر سارے رومانیہ میں پڑھی جاتی تھی۔ رومانیہ کے لوگوں کو یہ بات ناپسند تھی کہ ملک کے تمام وسائل صرف ایک شخص کے اوپر وقف کر دیئے جائیں۔ آخر کار دسمبر ۱۹۸۹ میں یہ لاوا پھٹ پڑا۔ عوام اور فوج دونوں نے چاؤسکو کے خلاف بغاوت کر دی۔ چاؤسکو نے اپنی حفاظت کے لیے اتنی بڑی پولیس بنا رکھی تھی جو فوج سے بھی زیادہ طاقت ور تھی۔ چنانچہ سخت تصادم ہوا۔ ستر ہزار آدمی مر گئے۔ اور تین سو ہزار آدمی زخمی ہوئے۔ چاؤسکو اپنے وسیع محل میں ہر وقت ایک ہیلی کاپٹر تیار رکھتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اب وہ اپنے اقتدار کو بچا نہیں سکتا تو وہ ہیلی کاپٹر پر بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ اس کو اندیشہ ہوا کہ اس کا سینی کاپٹر مارا کر ادا یا جائے گا۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر اتر کر زیر زمین پناہ گاہ (bunker) میں داخل ہو کر چھپ گیا۔ تاہم وہ یہاں بھی پکڑا گیا اور عین کرسمس کے دن ۲۵ دسمبر ۱۹۸۹ کو چاؤسکو اور اس کی بیوی ایلینا کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ آسمان نے بھی اس کو جگہ دینے سے انکار کر دیا اور زمین نے بھی۔

چاؤسکو اسٹالٹ اشتراکی تھا۔ وہ مذہب کا انتہائی سخت دشمن تھا۔ بخاریسٹ کا ریڈیو انڈیٹر اس کی موت کی خبر دیتے ہوئے چلا اٹھا۔ اس نے کہا کہ آفت کیسی حیرت ناک خبر ہے۔ مسیح دشمن عین کرسمس کے دن مر گیا :

Oh, what wonderful news. The anti-Christ  
died on Christmas Day.

اس طرح کے واقعات ۱۹۸۹ میں کثرت سے پیش آئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالم انسانوں نے مذہب کے خلاف جو قتلے بنائے تھے، وہ خدا کی طرف سے مسلسل ڈھائے جا رہے ہیں۔

روس میں سرکاری طور پر مذہب کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ مگر حالات کا دباؤ اتنا بڑھا کہ روس کی اشتراکی حکومت کو اپنے یہاں مذہبی آزادی کا اعلان کرنا پڑا۔ سوویت روس کے وزیر اعظم میخائیل گورباچوف نے خود وٹیکن پہنچ کر پوپ سے ملاقات کی۔ مشرقی جرمنی میں مذہب کو بظاہر مکمل طور پر ختم کر دیا گیا تھا۔ مگر وہ بالآخر سیلاب بن گیا اور برلن دیوار (Berlin wall) توڑ کر باہر آ گیا۔ چائڈسکو اپنے سارے اقتدار اور اہتمام کے باوجود بری طرح ہلاک کر دیا گیا۔ وغیرہ

اس طرح براہ راست خدا کی طرف سے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے مواقع کھولے جا رہے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر زبان میں قرآن اور حدیث اور سیرت پر سادہ اور سائنٹفک انداز کی کتابیں تیار کر کے تمام قوموں میں پھیلادیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اسلام کے نام پر کافی سرگرمی دکھانی ہے۔ مگر یہ سرگرمیاں زیادہ تر سیاست رخی رہی ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ تمام سرگرمیوں کو دعوت و تبلیغ کے رخ پر چلایا جائے۔ آج کے انسان کو "سیان مذہب" سے کوئی دل چسپی نہیں۔ وہ "روحانی مذہب" کا متلاشی ہے۔ وہ اپنی فطرت میں اٹھنے والی طلبِ خداوندی کا جواب چاہتا ہے۔ اگر اس وقت جدید انسان کے سامنے اسلام کو اس کی سادہ اور فطری صورت میں پیش کر دیا جائے تو انسان محسوس کرے گا کہ یہی وہ چیز ہے جس کو وہ اپنے اندرونی تقاضے کے تحت تلاش کر رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے تمام ضروری اسباب مہیا کر دیئے ہیں۔ اب مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ انہیں اور اسلام کو ہر خیمہ اور ہر گھر میں پہنچادیں۔

## دعوتی قوت

مکہ کے آخری دور میں جب قریش کا ظلم مسلمانوں پر بہت بڑھ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ مکہ چھوڑ کر حبش چلے جائیں۔ چنانچہ اسی سے اوپر کچھ لوگ حبش کی طرف ہجرت کر گئے۔ یہ اگرچہ ایک بہت تکلیف دہ واقعہ تھا۔ مگر اس میں اللہ نے خیر کی صورت پیدا فرمادی۔ اس کے ذریعہ اسلام کی دعوت بین الاقوامی دائرہ میں داخل ہو گئی۔

حبش کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی زندگی سراپا دعوت تھی۔ ان کی تبلیغ اور عمل سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے۔ چنانچہ حبش سے عیسائیوں کی ایک جماعت تحقیق حال کے لئے مکہ آئی۔ ان کی تعداد تیس سے اڑپنچھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ کی زبان سے اسلام کا پیغام سنا۔ آپ نے قرآن کے حصے پڑھ کر انہیں سنائے۔ وہ اتنا متاثر ہوئے کہ سب کے سب اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے۔

ابو جہل کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو وہ آیا اور ان لوگوں سے کہا:

ما رأینارکما احمق منکم - ارسلکم قومکم  
تعمون خبر هذا الرجل فہم تطعنون بجالسکم  
عندہ حتی فارقتہم دینکم وصدقتموہ فینما  
قال فقالوا سلام علیکم لا نجاہکم لت  
ما نحن علیہ وکنکم ما انتم علیہ۔

ہم نے تم سے زیادہ احمق کوئی قافا نہیں دیکھا  
تمہاری قوم نے تم کو اس لئے بھیجا کہ تم اس آدمی کی  
خبر لاکو۔ مگر تمہارا حال یہ ہوا کہ اس کے ساتھ بیٹھے  
ہی تم نے اپنا دین چھوڑ دیا اور اس کا اعتزاز کر لیا  
انہوں نے جواب دیا: تم پر سلامتی ہو، ہم تم سے  
بگشت نہیں کرتے۔ ہمارے لئے وہ ہے جس پر ہم  
ہیں اور تمہارے لئے وہ ہے جس پر تم ہو۔

حبش کے ان ایمان لانے والوں کا رویہ اللہ کو پسند آیا اور ان کے مطابق سورہ قصص کی آیات ۵۵-۵۶ آتیں۔

دعوت ایک ایسا قسمی جتیار ہے جو ہر حال میں اپنا کام کرتا رہتا ہے، خواہ داعی غالب ہو یا مغلوب۔ سچے داعی کے خلاف اس کے دشمنوں کی سرکوشش الٹی پڑتی ہے۔ یہ داعی کا ایسا (Advantage) ہے جو داعی حق کے سوا کسی اور کو میسر نہیں۔ داعی ہر حال میں تسخیری صفت

رکھتا ہے، خواہ بظاہر اس کے پاس کوئی قوت موجود نہ ہو

## ایک حدیث

حدیث کی کتابوں میں دور آخر کے بارہ میں بہت سی پیشین گوئیاں ہیں۔ ان میں سے ایک پیشین گوئی وہ ہے جس کو امام احمد اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے :

عن المقداد انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول : لا يبقى على ظهر الارض بيتٌ مَدْرٍ ولا وَبَرٍ الا دخله الله كلمة الاسلام بعز عزيز وذليل اما يئسهم الله فيجمعهم من اهلها او يذلتهم فيدينون لها

حضرت مقداد کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ زمین کی سطح پر کوئی نہ خیمہ یا گھر باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ اللہ اس میں اسلام کے کلمہ کو داخل کر دے گا۔ خواہ عزیز کی عزت کے ساتھ یا ذلیل کی ذلت کے ساتھ۔ اللہ یا تو انہیں عزت دے گا اور ان کو اہل اسلام میں سے بنا دے گا یا انہیں ذلیل کرے گا تو وہ

(مشكاة المنهاج . مجلد الاول . صفحہ ۲۰)

اس کے دین کو اختیار کر لیں گے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ آخری زمانہ میں اسلام ہر گھر میں داخل ہو جائے گا۔ مگر حدیث کے الفاظ کے مطابق، جو چیز گھروں کے اندر داخل ہوگی وہ اسلام کا کلمہ ہوگا نہ کہ اسلام کا سیاسی اور حکومتی اقتدار۔ کچھ لوگوں نے اس پیشین گوئی کو سیاسی داخلہ کے معنی میں لے لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ساری دنیا میں اسلام کا سیاسی جھنڈا لہرانے کے نام پر مدعو اقوام سے سیاسی لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ اس بے معنی لڑائی کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ اسلام سے بیزار ہو کر اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

اس پیشین گوئی کو واقعہ بنانے کے لیے مسلمانوں کو جو کام کرنا ہے وہ دعوت الی اللہ ہے۔ انہیں چاہیے کہ وہ توحید اور آخرت کے ربانی پیغام سے تمام قوموں کو باخبر کرنے میں ہم تن مصروف ہو جائیں، وہ اسلام کو فکری حیثیت سے ایک معلوم اور مسلم چیز بنا دیں، تاکہ جس کو ماننا ہے وہ مانے، اور جس کو نہیں ماننا ہے اس پر حجت قائم ہو جائے۔

عمل تبلیغ کی انتہا اتہام حجت ہے نہ کہ قیام حکومت۔

باب سوم :

# واقعاتِ دعوت

## تعارف اسلام

دہلی کی جامع مسجد کے پاس تھیوسوفیکل سوسائٹی کی ایک لائبریری ہے۔ مجھے سزائی بسنٹ کی ایک کتاب کی تلاش تھی۔ اس کتاب کو لینے کے لیے میں مذکورہ لائبریری میں ۲۴ جون ۱۹۷۹ کو گیا۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ حسب معمول اس دن ان کا ہفتہ وار اجتماع تھا۔ کتاب حاصل کرنے کے بعد دن کو ابجے میں ان کے اجتماع میں شریک ہو گیا۔ یہ پڑھے لکھے لوگوں کا اجتماع تھا۔ نیا چہرہ دیکھ کر انہوں نے مجھ سے فرمائش کی ”آپ بھی اپنے وچار رکھیں“ میں نے کہا کہ میں قرآن کا طالب علم ہوں اگر آپ پسند کریں تو میں یہ کر سکتا ہوں کہ یہ بتاؤں کہ قرآن کی تعلیم کیا ہے، انہوں نے کہا۔ ضرور۔ آپ یہی بتائیے۔ ہم آپ سے اس موضوع پر سنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ تقریر کی۔ اس تقریر میں سادہ انداز میں توحید، آخرت اور جنت و جہنم کی وضاحت کی۔ میں نے بتایا کہ قرآن کے مطابق زندگی کا اصل مسئلہ موجودہ دنیا کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ موت کے بعد آنے والی دنیا کا مسئلہ ہے۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ہم کس طرح زندگی گزاریں کہ ہماری اگلی زندگی کامیاب رہے۔ تمام لوگ بہت غور سے میری تقریر سننے رہے۔ تقریر کے بعد سوالات بھی ہوئے جن کا میں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جواب دیا۔

تقریر ختم ہونے کے بعد مجمع سے ایک صاحب اٹھ کر میرے پاس آئے اور میرا پتہ معلوم کیا۔ میں نے اپنا پورا پتہ بتا دیا۔ انہوں نے کہا کہ ٹیلنگ (نئی دہلی) میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کالاج ہے۔ وہاں زیادہ بڑے پیمانہ پر ہمارا پروگرام ہوتا ہے۔ ہم وہاں پر آپ کی تقریر رکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم ایک ساتھ ایک مہینہ (چار ہفتہ وار اجتماعات) کا پروگرام بنا کر چھپوا لیتے ہیں اور اس کو تمام ممبروں تک بھیج دیتے ہیں۔ اب ۱۵ جولائی تک ہمارا پروگرام سٹ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد کسی تاریخ کو ہم آپ کو زحمت دینا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد میری دوسری تقریر ۱۵ جولائی ۱۹۷۹ کو ہوئی۔ اس کا عنوان تھا: قرآن کا پیغام۔ ملک کے اکثر حصوں میں غیر مسلم حضرات کے اس طرح کے اجتماعات برابر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ اس کو پسند کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی وہاں آئیں اور سنجیدہ انداز میں اپنی بات پیش کریں۔ اسلام کے تعارف کے سلسلہ میں ہیں جو کچھ کرنا ہے۔ اس کے سلسلہ میں ایک کام یہ بھی ہے کہ اس طرح کے اجتماعات میں پہنچیں اور ان مواقع سے فائدہ اٹھائیں۔

## پیغمبر کا طریت

سیرت رسول کے مشہور راوی ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی قوم کے سامنے اسلام کا اظہار کیا اور کلمہ گھلا اس کا اعلان فرمایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا تو آپ کی قوم نے آپ سے دوری اختیار نہ کی اور نہ انھوں نے آپ کا انکار کیا۔

یہاں تک کہ آپ نے ان کے بتوں کا ذکر کیا اور ان پر عیب لگائے۔ جب آپ نے ایسا کیا تو انھوں نے آپ کے معاملہ کو اہمیت دی اور آپ سے اجنیت برتنے لگے۔ وہ آپ کی مخالفت اور دشمنی پر متحد ہو گئے۔ سو ان لوگوں کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ بچالیا۔ ایسے لوگ تھوڑے تھے اور چھپے ہوئے تھے:

فلما بادی رسول الله صلى الله عليه وسلم قومه بالاسلام وصدع به كما امره الله لم يبعد منه قومه ولم يردوا عليه. حتى ذكر آياتهم وعابها. فلما فعل ذلك اعظوه وناكروه واهجموا اخلاسه وعداوته الا من عصم الله تعالى منهم بالاسلام وهم قليل مستخفون (سيرة ابن هشام، الجزء الاول، صفحہ ۷۶-۷۷)

قدیم عرب کے مشرکوں کے بت دراصل ان کے قومی اکابر تھے جن کی تصویر بنا کر وہ ان کی تعظیم اور پرستش کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک توحید اور اخلاق کی بات کرتے رہے، تو مشرکین نے آپ کی بات کو برا نہ مانا۔ مگر جب آپ نے غیر خداؤں کی تقدیس اور پرستش کو غلط بتایا اور مشرکین کی غیر خدا پرستانہ روش پر تنقید کی تو وہ بگڑ گئے۔ یہی ہر زمانہ کا مسئلہ ہے۔ اگر لوگوں کے سامنے عمومی انداز میں صرف اخلاق اور انسانیت کی باتیں کیجئے تو بہ ایک آپ سے راضی رہے گا۔ لیکن اگر حق کی عمومی دعوت کے ساتھ لوگوں کی خلاف حق روش پر تنقید کی جائے اور ان کے اکابر کا تجزیہ کیا جائے تو فوراً لوگ پھرانٹیں گے۔ مگر پیغمبر کا طریقہ یہی ہے کہ دعوت کے ساتھ تجزیہ بھی کیا جائے۔ فیہمت کے ساتھ تنقید بھی کی جائے۔

جو لوگ بغیر خدا کو خدا کا مقام دیئے ہوتے ہوں وہ تنقید پر بھرتے ہیں۔ جو لوگ ایک خدا کی عظمتوں میں جی رہے ہوں وہ کسی انسان پر تنقید سے کبھی نہیں بچیں گے۔

## اسلامی طریقہ

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ بتوں کو توڑ دیا جائے۔ مثلاً مسند احمد کی ایک روایت حسب ذیل ہے:

عن ابن محمد الهذلی عن علی قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی جنازة فقال ایکم منطلق الی المدینة فلا یدع بہا وثنا الا کثرہ ولا قبراً الا سواہ ولا صورۃ الا لطحہا

ابو محمد ہذلی علی بن ابی طالب سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں تھے۔ آپ نے کہا تم میں سے کون ہے جو مدینہ جاتے اور وہاں کوئی بت نہ چھوڑے جس کو اس نے توڑ نہ دیا ہو۔ اور کوئی قبر نہ چھوڑے جس کو اس نے برابر نہ کر دیا ہو۔ اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جس کو اس نے مٹا نہ دیا ہو۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور طائف اور دوسرے مقامات کے بتوں اور مجسموں کو توڑا۔ مگر اس عمل کا تعلق صرف عرب سے تھا۔ عرب کو چوہو حکم خدا کے مطابق شرک اور آئینہ شرک سے پاک کرنا تھا۔ اس لئے وہاں کے لئے آپ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا۔ تاہم اس قسم کی تمام کارروائیاں فتح کے بعد ہوئیں، نہ کہ فتح سے پہلے

عرب کے علاوہ دوسرے مقامات کے لئے یہ اصول نہ تھا کہ وہاں کے بتوں اور مجسموں کو توڑا جائے۔ دوسرے ملکوں میں صرف تبلیغ کے اصول پر عمل کیا گیا اور سرکاری طور پر بتوں کو توڑنے کے بجائے اس کا انتظام کیا گیا کہ غیر مسلم اقوام مسلمان ہو جائیں اور اس کے بعد اپنے آپ ان کے بتوں کا خاتمہ ہو جائے

حضرت عمر بن خطاب کی خلافت کے زمانہ میں بہت سے عیسائی علاقے مسلمانوں کے قبضہ میں تھے۔ مگر ان کے بتوں کو توڑنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ مسلمان ایسے مکان یا عبادت گاہ میں داخل ہونے سے بچتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں پر تبلیغ و دعوت کا کام کرتے تھے مگر اقتدار کے باوجود انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ ان کے بتوں کو توڑنے لگیں۔ ایک روایت میں آتا ہے:

قال عمر رضی اللہ عنہ انا لاندخل کما شکم حضرت عمر نے عیسائیوں سے کہا کہ ہم تمہارے عبادت خانوں میں اس لئے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں

کتاب الصلوٰۃ

تصویری مجھے ہیں۔

۳۱ھ میں حضرت سعد بن وقاص کی سرکردگی میں مدائن فتح ہوا۔ مدائن فتح ہونے کے بعد حضرت سعد بن وقاص نے مدائن کے لوگوں کو دعوت دی اور انہیں اسلام میں داخل کرنے کے لیے کوشش کی۔ اس وقت آپ کی زبان پر سورہ دخان کی آیات ۲۵-۲۸ تھیں۔

یہ جمعہ کا دن تھا۔ قصر اسیض میں جس جگہ شہنشاہ کا تخت ہوتا تھا وہاں منبر رکھا گیا آپ نے اس منبر پر رکھ کر یہ خطبہ دیا اور جمعہ اور اکیلا یہ پہلا جمعہ تھا جو تیسری ایران کے دارالسلطنت میں ادا کیا گیا۔ فتح مدائن کے جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ شاہی محل میں جتنی بھی تصویریں اور مجسمے تھے سب بدستور باقی رکھے گئے۔ حضرت سعد بن وقاص نے ان کو توڑا اور نہ ان کو وہاں سے جدا کیا۔ اس سلسلے میں یہاں تاریخ کے دو حوالے نقل کئے جاتے ہیں:

سعد بن ابی وقاص ایوان کسری پہنچے۔ اور اس کے اندر فتح کی نماز پڑھی۔ اور جماعت نہیں کی۔ انہوں نے آٹھ رکعتیں پڑھیں، ان کے درمیان فضل نہیں کیا (ایک سلام سے آٹھ رکعتیں) اور اس کو مسجد بنایا حالانکہ اس میں انسان اور گھوڑے کے مجسمے موجود تھے۔ اور نہ سعد بن ابی وقاص نے اور نہ مسلمانوں نے اس سے تعرض کیا اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور سعد بن ابی وقاص نے کسری کے ایوان کو مسجد بنایا اور اس میں جو مجسمے تھے ان میں کوئی تبدیلی نہ کی۔

ثم انتهي الى ايوان كسرى و صلى فيه صلاة الفجر و كاصلى جماعة فصل ثمانية ركعات لا يفصل بينهم و اتخذها مسجداً و فيه تماثيل الجص رجال و فيل و لم يمتنع و لا المسلمون لذلك و تركوها على حالها (تاريخ الطبري، جلد ۴) و اتخذ سعد ايوان كسرى مصلی و لم يغيره ما فيه من التماثيل (الكامل في التاريخ جلد ۲)

صحابہ کرام نے جو کچھ کیا اس کی وجہ ان کا داعیان مزاج تھا۔ وہ اس قسم کے معاملات کو ہمیشہ دعوتی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا داعیان مزاج سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ توجیزان کے سامنے لاتا تھا وہ غیر مسلمانوں کو دعوت حق کا مخاطب بنانا تھا۔ بقیہ تمام چیزیں ان کی نظر میں ثانوی تھیں۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ اسلام میں سنی زبردست ملکی قوت ہے کہ غیر مسلم اقوام اس کے آگے سخر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اور جب تو میں سخر ہو جائیں تو بقیہ تمام مقاصد اپنے آپ حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ترک بھی مٹ جاتا ہے اور شرک کے تمام آثار اور علامات بھی۔

## جوہری فرق

واذا تمسلى عليهم آياتنا ماتوا قد سمعنا  
 لو فشاء لعلنا مثل هذا ان هذا الاساطير  
 الاولين (الانفال ۳۱)

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں  
 تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا۔ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی  
 ایسا ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو صرف پھیلوں کے قصے ہیں۔

اس آیت کے سنان نزول میں کہا جاتا ہے کہ قدیم کہ میں ایک شخص نصر بن حارث تھا۔ وہ تمہاری  
 مقصد سے فارس جاتا تھا۔ وہاں بادشاہوں کے قصے اور رستم اور اسفندیار کی داستانیں سنا اور  
 واپس آکر مکہ والوں کو سنا تا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھشت ہوئی تو آپ لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنانے  
 لگے۔ نصر بن حارث قرآن کا مذاق اڑاتا اور فارس کے بادشاہوں اور فوجی سرداروں کے مبالغہ آمیز  
 قصے سنا کر لوگوں سے کہتا کہ بت و کمد کا قصہ زیادہ اچھا ہے یا میرا (ایہما احسن قصماً، انا و احمد)  
 نصر بن حارث بدر کی جنگ میں گرفتار ہوا اور مارا گیا (تفسیر ابن کثیر، جلد ۲)

آج مکہ میں کوئی شخص یہ جملہ نہیں کہہ سکتا۔ پھر چودہ سو برس پہلے مکہ کے ایک شخص کو یہ جملہ کہنے کی  
 جرأت کیسے ہوئی۔ اس کی وجہ زنادق فرق ہے۔ چودہ سو سال پہلے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی  
 رسالت دونوں نزاعی (Controversial) حیثیت رکھتے تھے۔ مگر آج لمبی تاریخ کے نتیجے میں قرآن  
 کا کتاب الہی ہونا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبر خدا ہونا تسلیم شدہ واقعہ (Established fact)  
 بن چکا ہے۔

یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر پہلے ایک شخص کو نہ کورہ بات کہنے کی جرأت ہوتی تھی اور آج  
 کسی کو اس قسم کے الفاظ بولنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

صحابہ کا درجہ اس لئے بڑا ہے کہ انھوں نے جو ہر شناسی کی سطح پر قرآن کو اور پیغمبر کو پہچانا انہوں  
 نے اس وقت اپنے آپ کو اسلام سے وابستہ کیا جب کہ اسلام کی عظمتوں کا گنبد نہیں بنا تھا۔ آج جو لوگ  
 پر جوش اسلامی تقریریں کرتے ہیں وہ صرف گنبد شناسی کا کمال دکھاتے ہیں۔ اگرچہ بظہر خود وہ سمجھتے  
 ہیں کہ وہ حقیقت شناس کا ثبوت دے رہے ہیں۔

## دو قسم کے انسان

کئی دور کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ کے پاس گئے۔ ان کو اللہ کی طرف بلایا اور ان سے کہا کہ دعوتِ حق کے اس کام میں میری مدد کرو۔ ان میں سے ایک شخص اٹھا۔ اس کا نام بجمہ بن فراس تھا۔ اس نے کہا کہ اگر ہم اس معاملہ میں آپ کا ساتھ دیں پھر اللہ آپ کو آپ کے مخالفین پر غالب کر دے تو کیا آپ کے بعد اقتدار (امر) میں ہمارا حصہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا اقتدار اللہ کا ہے و جب سے چاہتا ہے اسے دیتا ہے۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں :

فقال له انهدفت نحو رنا للعرب اس نے آپ سے کہا کیا ہم آپ کی حمایت میں اپنے  
دونك فاذا اظهرك الله كان الامر سيدنا كوسارے عرب کا نشانہ بنائیں پھر جب اللہ  
لغيرنا؟ لاجحة لنا بامرک آپ کو غلبہ دے تو اقتدار ہمارے سوا دوسرے  
فابوا عليه۔ کا ہو جائے۔ ہم کو آپ کے دین کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ

(سیرت ابن ہشام جز ثانی صفحہ ۳۳)

یہ ایک قسم کے انسان کی مثال تھی۔ اب دوسرے قسم کے انسان کی مثال لیجئے۔

کئی زندگی کے آخری زمانہ میں مدینہ کے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور اسلام قبول کیا۔ لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے تو ان میں کا ایک شخص اٹھا۔ یہ عباس بن جادہ بن فضل انصاری تھے۔ انھوں نے کہا کہ اے قبیلہ خزرج کے لوگو کیا تم جانتے ہو کہ تم اس آدمی سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں۔ کب کہ تم تمام سرخ و سفید کے خلاف جنگ پر بیعت کر رہے ہو۔ اس میں تمہارے اموال برباد ہوں گے اور تمہارے بہترین افراد قتل کیے جائیں گے :

قالوا فاننا نخذنه على مصيبة الاموال وقتل الاشراف۔ فما لنا بئذ الله يا رسول الله ان نحن وقينا قال الجنة۔ قالوا البسط يدك فبسط يده فبايعوه۔

(الجزائری، ۵۵)

## بدگمانی

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ وہ اس وقت موجود تھے جب کہ رسول اللہ ﷺ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین کے بعد مالِ غنیمت کو لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ اس سلسلے کی ایک طویل روایت کا ایک حصہ یہ ہے :

جاء رجل من بني تميم يقال له ذو الحويصرة. بنو تميم کا ایک شخص آیا جس کا نام ذو الحویصرہ تھا۔  
فوقف عليه وهو يعطي الناس. فقال وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہو گیا۔  
يا محمد قد رأيت ما صنعت في هذا اور آپ اس وقت لوگوں کو دے رہے تھے۔ اس  
اليوم. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم، نے کہا کہ اے محمد، میں نے دیکھ لیا جو آپ نے آج  
اجل فكيف رأيت. فقال لم أراكم عدلت. کے دن کیلئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا  
اسية ابن شام، الجز الرابع، صفر ۱۴۴۰) ہاں، پھر تم نے کیا دیکھا۔ اس نے کہا کہ میں نے نہیں  
دیکھا کہ آپ نے انصاف کیا ہو۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ عیینہ بن حصن مدینہ آئے اور اپنے بھتیجے حمر بن قیس کے یہاں ٹھہرے۔ پھر وہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ روق بنے کے یہاں اجازت لے کر حاضر ہوئے۔ جب وہ آئے تو انھوں نے کہا :

هي يا ابن الخطاب. فوالله ما تعطين الجن ولا تحکم فينا بالعدل۔ اے خطاب کے لڑکے، خدا کی قسم آپ نہ ہم کو کچھ دیتے ہیں اور نہ ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں۔  
(رياض الساميين صفر ۱۱۳)

مذکورہ دونوں الزام یقینی طور پر غلط تھے۔ پھر بھی دو معصوم ترین روحوں پر الزام لگانے کے لیے لوگوں نے الفاظ پالیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کسی کے مزاح ثابت ہونے کے لیے یہ کافی نہیں کہ کچھ لوگ اس کے خلاف کچھ الفاظ پالیں۔ لوگوں کو بہر حال اس قسم کے الفاظ ملتے رہیں گے کہ وہ جس کو بدنام کرنا چاہیں بدنام کریں۔ یہاں تک کہ قیامت کا زلزلہ آئے اور لوگوں سے ناحق کلام کرنے کی آزادی چھین لے۔

## جھوٹا یقین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مخالفین کے ساتھ جو جنگیں پیش آئیں ان میں سے ایک جنگ وہ تھی جس کو جنگ احد کہا جاتا ہے۔

اس جنگ میں بعض وجوہ سے مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت زخمی ہو گئے۔ مسلمانوں کی فوج منتشر ہو گئی۔ روایات میں آتا ہے کہ جب مخالفین نے دیکھا کہ ان کی فتح مکمل ہو چکی ہے تو ان کے سردار ابوسفیان (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) ایک ٹیلہ پر چڑھے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنی فتح کا اعلان کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا :

لناعتنّی ولاعتنّی لکم  
ہمارے پاس عزّی ہے اور تمہارے پاس کوئی عزّی  
نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو صحابہ سے فرمایا کہ تم اس کا جواب اس طرح دو :

الّا اللّٰہ مولانا ولا مولانا لکم  
اللہ ہمارا کارسنا ہے اور تمہارا کوئی کارسنا نہیں  
عزّی قدیم عرب کا ایک بڑا بت تھا۔ عرب کے مشرکین کو اس بت پر زبردست یقین تھا۔ اگر  
انہیں یقین نہ ہوتا تو اس نازک موقع پر ان کے سردار کی زبان سے یہ جملہ نہ نکلتا کہ لنعزّی  
ولاعتّی لکم۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک جھوٹی چیز پر بھی ایک آدمی کو کتنا گہرا یقین ہو سکتا ہے۔ عزّی  
محصّ ایک پتھر کا مجسمہ تھا۔ اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ تھا۔ مگر قدیم عرب کے مشرکین کو یقین تھا کہ اس  
عزّی کی وجہ سے ان کو مسلمانوں کے اوپر فتح حاصل ہوتی ہے۔ عزّی کی اہمیت ان کے نزدیک پیغمبر  
آخر الزماں اور آپ کے اصحاب کرام سے بھی زیادہ تھی۔ جو فخر آج مسلمانوں کو اپنے پیغمبر اور اصحاب  
پیغمبر پر ہے وہی فخر اس وقت کے مشرکین کو اپنے عزّی پر تھا۔

جھوٹا یقین ہر دور میں انسان کا سب سے بڑا مرض رہا ہے۔ وہ آج کے لوگوں میں بھی اتنا ہی  
عام ہے جتنا کہ وہ پچھلے زمانہ کے لوگوں میں عام تھا۔ سچائی کو اس دنیا میں صرف وہ شخص پاتا ہے  
جو جھوٹے یقین کے خول کو توڑ کر اس کے باہر آسکے۔

## پھر بھی انھیں الفاظ مل گئے

مکہ کے سردار قبیلہ بنی ہاشم سے مطالبہ کرتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالے کر دیں تاکہ وہ آپ کو قتل کر دیں۔ مگر بنو ہاشم کے سردار ابوطالب نے کہا: خدا کی قسم محمد کو تم تمہارے حوالے نہیں کریں گے، یہاں تک کہ ہمارا ایک ایک شخص ہلاک ہو جائے۔ بالآخر نبوت کے ساتویں سال قریش نے بنو ہاشم کے خلاف بائیکاٹ کا معاہدہ لکھا جو کعبہ کے اندر آویزاں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بنو ہاشم مجبور ہوئے کہ مکہ کے باہر ایک گھاٹی (شعب بنی المطلب) میں پناہ لیں

یہ بے حد سخت امتحان تھا۔ گھر کا اندوختہ شروع کے کچھ دنوں میں کام آتا رہا۔ اس کے بعد یہ نوبت آگئی کہ درخت کی جڑوں اور پتوں سے لوگ پیٹ بھرنے لگے۔! ہر کا قافلہ مکہ آتا تو آپ کے ساتھی بازار بھارتے کچھ کھانے پینے کا سامان خرید کر لائیں۔ مگر ابولہب نکل کر تاجروں سے کہتا کہ تم لوگ محمد کے ساتھیوں کو اتنی زیادہ قیمت بتاؤ کہ وہ خریدنے سے عاجز رہیں۔ چنانچہ وہ قیمتیں بہت بڑھا دیتے اور آپ کے ساتھی اس حال میں واپس آتے کہ ان کے بچے بھوک سے رو رہے ہوتے اور ان کا پیٹ بھرنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہ ہوتا۔

جب تین سال گزر گئے تو ایسا ہوا کہ دیمک کعبہ کے اندر داخل ہوئی اور مذکورہ ظالمانہ معاہدہ (صحیفہ) کو کھا گئی۔ اللہ کے نام کے سوا اس میں کچھ باقی نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر کر دی۔ آپ نے ابوطالب سے اس کو بیان کیا۔ ابوطالب نے کہا، کیا آپ کے رب نے آپ کو اس سے باخبر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں۔ اس کے بعد ابوطالب قریش کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ میرے بھتیجے نے مجھے بتایا ہے، اور وہ مجھی جھوٹ نہیں بولتا، تمہارے صحیفہ پر خدا نے دیمک مسلط کر دی اور وہ اس کی تمام ظلم و جور کی دفعات کو کھا گئی، اب اس میں صرف خدا کا نام باقی رہ گیا ہے، اس لئے تم لوگ کعبہ کا دروازہ کھول کر اس صحیفہ کو دیکھو۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو تم کو چاہئے کہ تم اپنے ظلم سے باز آ جاؤ۔

قریش کے سردار اس پر راضی ہو گئے۔ انھوں نے کعبہ کا دروازہ کھول کر صحیفہ نکالا تو واقعہ وہ خیر بالکل صحیح تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دی تھی، مگر اس کے باوجود وہ اپنے ظلم اور سرکشی سے باز نہ آئے اور ابوطالب سے کہا: یہ تمہارے بھتیجے کا جادو ہے (هٰذِنَا سِحْرُ) (ابن اخیلث)

## جھوٹی مخالفت

قدیم مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن آپ کے خلاف جو باتیں مشہور کرتے تھے، ان میں سے ایک بات یہ بھی کہ قرآن خدا کا کلام نہیں، وہ ایک بناوٹی کلام ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انکار کرنے والے لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک جھوٹ ہے جس کو انھوں نے گھڑ لیا ہے، اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس میں ان کی مدد کی ہے۔ پس یہ لوگ ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے (الفرقان ۴)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم کو معلوم ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ (محمد کو یہ کلام) ایک آدمی سکھاتا ہے۔ جس شخص کی طرف وہ منسوب کرتے ہیں اس کی زبان گھمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی زبان میں ہے۔ (النحل ۱۰۳)

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں کچھ افراد تھے جو یہودیوں کی زبان جانتے تھے، مثلاً ابو نکیہ، عداس، جبر۔ وہ تورات وغیرہ پڑھتے تھے۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے تحت ان سے بھی ملے تھے، اس کو مخالفین نے شوشہ بنا لیا:

ان التَّبِيعِيَّاتِ هِيَ لَللَّهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُبِّمَا جَلَسَتْ اِلَيْهِمْ لِيُعَلِّمَهُمْ مِمَّا عَلَّمَهُ اللهُ..... فَقَالَ الْكُفَّارُ  
اِسْتَمَايَتْ عَلَّمَ مَرَحَمًا قَوْمِنَا  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی ان لوگوں کے پاس بیٹھے تھے تاکہ ان کو اس بات کی تعلیم دیں جس کی تسلیم اللہ نے آپ کو دی ہے۔ پس کافروں نے کہا کہ محمد تو انھیں لوگوں سے سیکھتے ہیں۔ (تفسیر القرطبی ۱۰/۱۷۸)

مذکورہ افراد مکہ کے معمولی افراد تھے۔ ان میں سے کوئی غلام تھا اور کوئی لوہار تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین چونکہ آپ کی شخصیت کو اور آپ کے کلام کو بالکل بے وزن سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے آپ کو انھیں معمولی لوگوں سے منسوب کر دیا کہ یہی افراد ہیں جو آپ کا ذریعہ معلومات ہیں۔

مزید یہ کہ انھوں نے سکھانے کے معاملہ کو سیکھنے کا معاملہ بنا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس اس لیے بیٹھے تھے کہ ان کو تعلیم دیں۔ مگر بات کو بدل کر انھوں نے یہ کہہ دیا کہ آپ خود ان سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

مخالفت کس طرح آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ جب آدمی کسی کے خلاف عناد میں مبتلا ہو جائے تو کھلی حقیقتیں بھی اس کو نظر نہیں آتیں۔ وہ سیدھی بات کو پیڑھے معنی پہناتا دیتا ہے۔

## رسول کو ماننا

احد کی جنگ میں جب ایک غلطی سے مسلمانوں کو شکست ہوئی تو لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی عزم و توکل کے ساتھ اپنی جگہ قائم رہے۔ آپ کے ساتھ چند افراد بھی تیروں اور تلواروں کی بارش میں جھے رہے۔ اس وقت ایک مشرک عبداللہ بن قیس نے آپ کی طرف پتھر پھینکے۔ یہ دیکھ کر آپ کے ساتھیوں میں سے حضرت مصعب بن عمیر اس کی طرف چڑھے۔ دونوں میں جنگ ہوئی۔ عبداللہ بن قیس نے حضرت مصعب بن عمیر کو قتل کر دیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ خود رسول اللہ تھے۔ اس نے آپ کو اپنی تلوار سے ہلاک کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ یہ آواز لگاتا ہوا واپس ہوا: الا ان محمد اذ قتل الا ان محمد اذ قتل (سنو، محمد قتل کر دئے گئے۔ سنو، محمد قتل کر دئے گئے)

یہ خبر پھیلی تو مسلمانوں میں سے جو لوگ ادھر ادھر بکھر گئے تھے وہ بھی اس سے متاثر ہوئے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک طویل روایت ہے۔ اس میں یہ الفاظ آتے ہیں:

قال اناس من اهل النفاق ان كان محمد قد قتل فالحقوا بدينكم الاول - فقال انس بن النضر يا قوم ان كان قد قتل محمد فان رب محمد لم يقتل (التفسير المظهری)

کچھ اہل نفاق نے کہا کہ اگر محمد قتل کر دئے گئے ہیں تو اب اپنے پہلے دین میں شامل ہو جاؤ۔ انس بن نضر نے کہا اے لوگو، اگر محمد قتل کر دئے گئے ہیں تو محمد کا رب تو قتل نہیں ہوا۔

ایک روایت کے مطابق ایک انصاری نے کہا: ان كان محمد قتل فقد بطلت فقاتلوا عن دينكم (اگر محمد قتل کر دئے گئے ہیں تو وہ اپنا دین پہنچا چکے تو اب تم اس دین کے لئے لڑو، تفسیر ابن کثیر) اس پر قرآن میں یہ آیت اتری کہ محمد تو صرف ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دئے جائیں تو تم اٹنے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو شخص اٹنے پاؤں پھر جائے تو وہ ہرگز اللہ کا کچھ نہیں لگا دے گا۔ اور اللہ شکر گزاروں کو بدلہ عطا فرمائے گا (آل عمران 143)

کچھ لوگ وہ ہیں جو محمد کو اس حیثیت سے پہچانتے ہیں کہ انہوں نے دنیا کو فرج کیا۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو آپ کو اس حیثیت سے پہچانتے ہیں کہ آپ نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلا یا حقیقی مومن وہ ہے جو محمد کو داعی کے روپ میں پہچانے۔ جو لوگ آپ کو فاتح کے روپ میں پہچانیں ان کی پہچان صرف مورخ کی پہچان ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں مومن کی پہچان۔

## دین فطرت

ایک مسلمان جون پور سے اعظم گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔ ٹیکسی میں ایک ہندو بھائی بھی تھے۔ ابتدائی تعارف کے بعد انھوں نے کہا: آپ لوگ تو پہلے ہندو تھے، پھر آپ اپنے پرانے دھرم پر کیوں نہیں آجاتے۔ مسلمان نے کہا کہ اسلام نے ہم کو توحید دی ہے، آپ ہمیں کیا دیں گے۔ اگر آپ ہمیں مورتی پوجا دیں، تو اس کو تو آپ خود ہی چھوڑ رہے ہیں۔ اسلام نے ہمیں سماجی برابری دی ہے۔ اس کے بدلے آپ ہمیں کیا دیں گے۔ اگر آپ ہم کو ذات پات اور چھو اچھوت دیں، تو اس سے بھی آپ لوگ خود ہی برأت کر رہے ہیں۔ ہندو بھائی یہ باتیں سن کر خاموش ہو گئے۔

ایک مسلمان اپنے گھر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک شخص وہاں آیا۔ اس نے کہا کہ میں گورکھپور کا ایک برہمن ہوں۔ میرے دل میں کئی سال سے ایک کھٹک ہے۔ میں نے بہت سے پتہ ڈتوں اور پادریوں سے پوچھا۔ مگر مجھے اطمینان نہ ہو سکا۔ میں اس تلاش میں ہوں کہ آدمی کے لیے نجات کا ذریعہ کیا ہے۔ مسلمان نے کہا کہ نجات کا راستہ ہے — خدا کو ایک ماننا، آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر تسلیم کرنا، اور ان کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق آخرت کی فکر کرنا۔ برہمن نے کہا کہ میں اسلام کی ان تینوں ہی باتوں کو مانتا ہوں۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں مغرب کی اذان ہو گئی۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ مسلمان نے کہا کہ چلے، مسجد میں چل کر نماز پڑھ لیں۔ انھوں نے کہا کہ میں کیسے نماز پڑھوں گا، میں تو ہندو ہوں۔ مسلمان نے کہا کہ جب آپ اسلام کی ان تین بنیادی باتوں (توحید، رسالت، آخرت) کا اقرار کرتے ہیں تو آپ مسلم ہیں۔ وہ راضی ہو گئے اور وضو کر کے مسلمان کے ساتھ مغرب کی نماز میں شریک ہو گئے (ذی جمعیت، ۱۵ اپریل ۱۹۸۹)۔

اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کس قدر سادہ مذہب ہے۔ اسلام کی یہ سادگی ہی اسلام کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اسلام اتنا زیادہ سادہ مذہب ہے کہ ہر مسلمان اس کو سمجھ سکتا ہے اور دوسروں کے اوپر اس کی تبلیغ کر سکتا ہے۔ وہ اتنا فطری مذہب

ہے کہ کوئی بھی شخص جو اس کو خالی الذہن ہو کر سنے، وہ فوراً اس کے دل کو ایبل کرے گا۔

اسلام کے پھیلنے میں رکاوٹ صرف اس وقت ہوتی ہے جب کہ اسلام کو سننے اور سمجھنے کے لیے معتدل فضا باقی نہ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اگر اجنبیت حائل نہ ہو اور ان کے درمیان تساؤل کا ماحول ختم ہو جائے تو منظم تبلیغی کوششوں کے بغیر اپنے آپ تبلیغ ہونے لگے۔ دونوں فرقوں کے درمیان روزانہ کا عام میل جول ہی اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بن جائے۔

دوسرے مذاہب جو آج دنیا میں پائے جاتے ہیں، ان میں عقائد اور عبادات کا نظام اتنا پیچیدہ ہے کہ صرف اعلیٰ تربیت یافتہ (پنڈت اور پادری) ہی اس کی تبلیغ کر سکتے ہیں۔ اسلام کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام ایک انتہائی سادہ اور کامل طور پر ایک فطری مذہب ہے۔ اس لیے ہر مسلمان اس کی تبلیغ کر سکتا ہے، ہر مسلمان اس کی اشاعت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

ہزاروں لوگ جو ہر روز دنیا کے مختلف حصوں میں اسلام قبول کرتے رہتے ہیں، ان کا معاملہ زیادہ تر یہی ہے، وہ کسی تربیت یافتہ مبلغ کی تبلیغ سے اسلام میں داخل نہیں ہوتے۔ بلکہ بیشتر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے میل جول کے درمیان انھیں اسلام کی کسی تعلیم کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس سے ان کے اندر تلاش کا جذبہ جاگتا ہے۔ اس کے بعد وہ قرآن یا دوسری اسلامی کتابیں پڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ مزید متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے یہاں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

روسنا توری (Rosanna Da La Torre) ایک امریکی خاتون ہیں۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ پہلے وہ ایک فیشن پسند لڑکی تھیں۔ مگر اب وہ اسلامی طریقہ کے مطابق باحجاب زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کے قبول اسلام کے بارہ میں ان کا ایک خط امریکی مسلمانوں کے جریدہ اسلامک ہورائزن (Islamic Horizons) کے شمارہ دسمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا ہے۔

وہ لکھتی ہیں کہ میں کیسل فورنیا کی ایک کیتھولک خاندان میں پیدا ہوئی۔ میرے والدین بچپن سے مجھ کو چرچ لے جاتے تھے۔ وہاں میں دیکھتی تھی کہ لوگ مسیح کے اسٹیچو کے آگے جھک رہے ہیں۔ مگر میرا دل کبھی اس پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں یہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ اسٹیچو کے

اندھ خدایے :

I did not associate deity to a statue.

اس بنا پر میرے اور میرے خاندان کے درمیان ایک کشمکش جاری رہتی تھی۔ تاہم میرا تماش کا جذبہ ختم نہیں ہوا۔ میں نے مسیت اور دوسرے مذہبوں کا مطالعہ شروع کیا۔ مگر مجھے اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔ اس وقت تک مجھے اسلام کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔

ابوظہبی (عرب امارات) کی ایک مسلم خاتون علاج کے لیے لاس انجلس آئیں۔ اس دوران میں ان سے میری ملاقات ہوئی۔ جب وہ واپس جانے لگیں تو انہوں نے دعوت دی کہ میں بھی ان کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے ابوظہبی چیلوں۔ اس طرح میں امریکہ سے ابوظہبی پہنچی۔ وہاں ایک روز میرے کان میں ایک نئی آواز آئی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ "اذان" ہے۔

مؤذن بلند آواز سے پکار رہا تھا: اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ اکبر اللہ اکبر! اس نئی آواز نے حساتون کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ چرچ کے اندر انہوں نے دیکھا تھا کہ خدا ایک محدود اسٹیج کے روپ میں رکھا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسیحی چرچ یہ کہہ رہا تھا کہ خدا چھوٹا ہے۔ یہاں یہ اعلان سنائی دیا کہ خدا بڑا ہے۔ امریکی خاتون کو چرچ کی بات غیر معنی اور حلاف واقعہ محسوس ہو رہی تھی، اس کے مقابلہ میں مسجد کی بات پوری طرح معقول اور مطابق واقعہ نظر آئی۔ چرچ کا پیغام انہیں متاثر نہ کر سکا تھا، مگر مسجد کا پیغام ان کی فطرت کی آواز بن کر ان کے سینے میں اتر گیا۔

اس تاثر کے تحت جب مؤذن نے پکارتے ہوئے کہا کہ اَوْفِلاح کی طرف (حی علی الفلاح) تو امریکی حساتون کو ایسا محسوس ہوا جیسے خدا ان سے مخاطب ہو کر یہ کہہ رہا ہو کہ روستا، میری طرف آؤ۔ کیوں کہ میں ہی وہ سچائی ہوں جس کی تمہیں تلاش ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ اذان کا پیغام نہایت طاقت ور تھا، وہ بجلی کی کوند کی طرح میرے دل پر اتر کر گیا۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ابتداءً میرے اندر اسلام سے دل چسپی پیدا کر دی :

The message of the Adhan was powerful. It hit my heart like a bolt of lightning. This is what sparked my interest in Islam. (p. 4)

خاتون موصوف لکھتی ہیں کہ اس کے بعد میں نے اسلامی کتابوں کو پڑھنا شروع کیا۔ اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ اور قرآن کا مطالعہ کیا۔ الحمد للہ، اللہ نے مجھے اسلام کی نعمت بخشی۔ میری پیاس آخری طور پر بجھ گئی۔ زندگی کے بارے میں میرا پورا نقطہ نظر بدل گیا۔ اب مجھے پوری طرح سکون اور خوشی حاصل ہے۔

اسلام اپنی ذات میں تبلیغ ہے۔ وہ خود بخود لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اگر مسلمان ایک طرز صبر کے ذریعہ نفرت اور تناؤ کی فضا کو ختم کر دیں تو کسی رسمی تبلیغ کے بغیر اسلام لوگوں کے اندر نفوذ کرنا شروع کر دے گا۔

## دعوتی تسخیر

حال میں فرانس کے ایک مشہور آرٹسٹ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس کا سابق نام برنارڈ جو ہے۔ اور موجودہ اسلامی نام عبدالعزیز ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مجھے اپنے فن سے عشق تھا اور اس کے لیے میں دنیا کے مختلف ملکوں میں کثرت سے سفر کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں میں مصر گیا اور قاہرہ اور اسکندریہ میں چند روز قیام کیا۔

ایک روز جب کہ میں قاہرہ کی سڑکوں پر چل رہا تھا، میرے کان میں ایک پرکشش آواز آئی۔ یہ اذان کی آواز تھی جو مسجد کے میناروں سے بلند ہو رہی تھی۔ اس قسم کی آواز میں نے پہلی بار سنی تھی۔ مجھے مزید جستجو ہوئی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ نماز کی پکار ہے تو میں مسجد میں گیا اور لوگوں کو صاف بستہ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اذان کی آواز اور نماز کے مناظر نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ میں فرانس واپس آیا تو میں نے اسلامی لٹریچر تلاش کر کے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا۔ میں نے قرآن کی تلاوت کے کیسٹ سنیے۔ ان عربی کیسٹوں کو اگرچہ میں سمجھتا نہ تھا، مگر ان کا سننا مجھے اچھا لگتا تھا، اس لیے میں ان کو سناتا رہا۔

اس کے بعد میں دوبارہ مصر گیا۔ وہاں میں نے الازھر کے علماء کے سامنے اسلام قبول کر لیا۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ سابق ”برنارڈ جو“ اور موجودہ ”عبدالعزیز“ میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اسلامی عقیدہ نے میرے طریقہ کو بدل دیا ہے۔ تاریکی کے بداب میں روشنی میں آ گیا ہوں۔ مجھے اپنے اندر ایک ایسا سکون محسوس ہو رہا ہے جس سے میں اس سے پہلے کبھی آشنا نہ تھا۔ اسلام میری روح اور میرے جسم میں خون کی طرح رواں دواں ہے (صفحہ ۶)

یہ کوئی ایک مثال نہیں۔ فرانس میں (اور اسی طرح دوسرے مغربی ملکوں میں) کثرت سے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ خود فرانس میں پچھلے سالوں میں روجیہ جارودی، مائیکل شوڈ کیونز اور مورلیس جبار وغیرہ جیسے بہت سے مشہور اور ممتاز لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اور برابر داخل ہو رہے ہیں۔ ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے ریاض کے ہفت روزہ السّہوۃ (۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ ۳۰ نومبر ۱۹۸۹ء) نے لکھا ہے:

رغم كل محاولات الحاددين من مستشرقين أو غيرهم والذين يحاولون النيل من الإسلام وتشويه صورته إلا أنه ينتشر كالبلسم الشافي لحجروب الانسان على الارض. فلا الحروب الصليبية كسرت شوكته ولا المستشرقين فالوا منه ولا الآيات الشيطانية حدث من دخول الناس في دين الله أفواجا.

اگرچہ مستشرقین اور دوسرے مخالفین اسلام کو بدنام کرنے اور اس کی تصویر بگاڑنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اس کے باوجود اسلام انسانوں کے زخموں کے لیے ایک شفا بخش مرہم کی طرح دنیا میں پھیل رہا ہے۔ صلیبی لڑائیاں اس کی عظمت کو توڑنے سکیں اور نہ مستشرقین کی تحریروں یا "آیات شیطانی" جیسی کتابیں لوگوں کو دین خدا میں فوج در فوج داخل ہونے سے روکنے والی ثابت ہوئیں۔

یہ واقعات ظاہر کر رہے ہیں کہ مخالفین کی مخالفتوں سے گھبرانے یا ان پر شور و غل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اسلام کی اپنی تفسیری طاقت پر اعتماد رکھیں، وہ دوسروں کی مخالفانہ کارروائیوں کو کوئی اہمیت نہ دیں۔

تاریخ نے بار بار یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام خود اپنی ذات میں ایک طاقت ہے۔ اس کی یہ طاقت نہ سیاست کے خاتمہ سے فنا ہوتی اور نہ دوسروں کی سازشوں سے۔ اسلام ہر حال میں خود اپنی سنکری اور نظریاتی طاقت کے بل پر پھیلتا ہے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کا اخلاقی یا قومی زوال بھی اس کے اشاعی عمل کو روکنے والا نہیں۔

واقعات بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال کے زمانہ میں اسلام نے انتہائی تیزی کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے بگاڑ کے زمانہ میں بھی اپنی پیش قدمی برابر جاری رکھی ہے۔ ایسی حالت میں یا یوسی یا مسریا کی کیا ضرورت۔

## حوصلہ مندی

سرسی وی رمن (1888-1946) ایک مشہور ہندوستانی رائٹس داں ہیں۔ انھوں نے روشنی کی سائنس میں ایک نیا اصول دریافت کیا جو انھیں کے نام پر رمن ایفکٹ (Raman Effect) کہا جاتا ہے۔ اسی دریافت کی بنا پر انھیں 1930 میں فزکس کا نوبیل انعام دیا گیا۔

رمن تمل ناڈو کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے انتہائی محنت کے ساتھ پڑھا۔ یہاں تک کہ بی ایس سی اور ایم ایس سی میں انھوں نے مدراس یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ وہ نہایت حوصلہ مند آدمی تھے، انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سر آسو توشس مکر جی کے سامنے یہ عہد کیا کہ میں نوبیل انعام کو نہر سوئز کے مشرق میں لے آؤں گا:

I will bring the Nobel prize east of the Suez.

اس عہد کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے بے پناہ محنت شروع کی۔ تاہم ریسرچ کی آسانیاں انھیں حاصل نہ تھیں۔ معاشی ضرورت کے تحت انھوں نے کلکتہ میں ایک سرکاری ملازمت کرنی تھی۔ ایک روز وہ ٹرام کے ذریعہ جو بازار (کلکتہ) سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک عمارت پر سب ذیل الفاظ کا ایک بورڈ لگا ہوا ہے:

The Indian Association for the Cultivision of Science

یہ بورڈ دیکھ کر وہ چلتی ٹرام سے کود پڑے۔ اس ادارہ میں جا کر معلومات کیں۔ پتہ چلا کہ یہاں ریسرچ کی سہولتیں موجود ہیں۔ اس کے بعد وہ صبح سویرے وہاں پہنچ جاتے اور آفس کے وقت تک مسلسل اپنے تحقیق اور تجربے میں لگے رہتے۔ اسی طرح شام کو آفس سے چھٹی پاتے ہی دوبارہ وہاں پہنچ جاتے اور رات تک وہاں مشغول رہتے۔ اس طرح پندرہ سال کی مسلسل محنت سے انھوں نے وہ سائنسی قانون دریافت کیا جس پر انھیں دنیا کا معزز ترین علمی انعام (نوبیل پرائز) دیا گیا۔ رمن کو یہ دھن بھتی کہ وہ نوبیل انعام کو سوئز کے مشرق میں لے آئیں اور وہ اس کو لے آئے۔ مگر آج خدا کے بندوں میں کوئی نہیں جو اس لیے تڑپ اٹھا ہو کہ وہ خدا کے دین کو سوئز کے مغرب میں لے جائے گا۔ خدا کا دین "سوئز" کو پار کرنے کے لیے آج بھی کسی حوصلہ مند کا انتظار کر رہا ہے۔

## سابق شاہ روس

ولادیمیر اول (Vladimir I) ۹۵۶ء میں پیدا ہوا، اور ۱۰۱۵ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ روس کا پہلا عیسائی بادشاہ ہے۔ وہ ابتداً زبت پرست تھا۔ اس نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اس کے بعد اس نے روسی باشندوں کو عیسائی بنانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ تمام بت دریاؤں میں پھینک دیئے گئے۔

گیارہویں صدی عیسوی کے ایک مسیحی راہب یعقوب (Jacob) نے اس سلسلہ میں جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ بہت سبق آموز ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ شاہ روس ولادیمیر کا یقین اپنے آبائی مذہب (بت پرستی) سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے تحقیق کے لیے یہودی، عیسائی اور اسلامی علماء کو بلا لیا۔ اور ہر ایک سے اس کے مذہب کے بارہ میں مفصل گفتگو کی (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ۱۹۸۲ء، تذکرہ ولادیمیر)

یعقوب کے بیان کے مطابق یہودی علماء نے کہا کہ ہمارا خدا ہم سے ناراض ہے۔ اس لیے ہم کو نہیں معلوم کہ ہمارا مقام زمین میں ہے یا آسمان میں۔ ولادیمیر نے کہا کہ مجھے ایسے مذہب کی ضرورت نہیں۔

مسلم علماء کی زبان سے اسلام کی تعلیمات سن کر اس کو اسلام سے دلچسپی ہوئی۔ حتیٰ کہ وہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ مگر اس نے کہا کہ میں شراب کا بہت زیادہ عادی ہوں، میں اور سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں مگر میں شراب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مسلم علماء نے کہا کہ ہمارے مذہب میں شراب حرام ہے اس لیے اگر تم اسلام قبول کرتے ہو تو تم کو شراب بھی لانا چھوڑنی پڑے گی۔ اس نے علماء سے بہت زیادہ کہا کہ شراب کے معاملہ میں اسے رخصت دیدی جائے۔ مگر علماء راضی نہیں ہوئے۔ چنانچہ بات ختم ہو گئی اور شاہ روس اسلام قبول کرنے سے باز رہا۔

اس کے بعد شاہ روس ولادیمیر نے عیسائی مذہب کے لوگوں سے گفتگو کی۔ عیسائی عالموں نے زیادہ حکمت اور دانش مندی کا ثبوت دیا وہ اگرچہ اپنے مذہب اور عقائد کے معاملہ میں بادشاہ کو زیادہ مطمئن نہ کر سکے۔ مگر انھوں نے شراب کے معاملہ میں بادشاہ کو رخصت دے دی۔

مسیحیت پر اصولی اعتبار سے مطمئن نہ ہونے کے باوجود عملی اعتبار سے اس نے اس کو پسند کر لیا۔ چنانچہ گنگو کے آخر میں شاہ روس نے مسیحی مذہب کو اختیار کر لیا۔ پروفیسر ابرٹس کے الفاظ میں :

It was a turning-point in Russian history and culture.  
J.M. Roberts, *The Pelican History of the World*.  
Penguin Books Ltd., 1980, p. 355.

یہ واقعہ روس کے تاریخ اور کلچر میں ایک نقطہ انقلاب بن گیا۔ ایک ملک جس کا مستقبل اسلام کی طرف جا سکتا تھا، اس کا مستقبل مسیحیت کی سمت میں چلا گیا۔

جن علمائے سابق شاہ روس سے گنگو کی، ان کو اسلام کا ایک مسئلہ معلوم تھا، مگر ان کو اسلام کا دوسرا مسئلہ معلوم نہ تھا۔ وہ حرام و حلال کے قانونی مسئلہ کو جانتے تھے مگر وہ حکمت دعوت کے زیادہ گہرے مسئلہ کو نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے وہ نادانی کی جو اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

اسلام میں بلاشبہ شراب کو حرام کیا گیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ شراب اول روز سے حرام نہ تھی۔ مکہ میں جو لوگ مسلمان ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے توحید اور رسالت کی بیعت لیتے تھے مگر شراب چھوڑنے کا حکم نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ مکہ کے اہل ایمان میں ایسے لوگ شامل تھے جو اسلام کے باوجود شراب پیئے رہے۔ انھوں نے بعد کو اس وقت شراب پینا چھوڑا جب کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آنے اور شراب کے بارہ میں آخری حکم نازل ہو گیا۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا آغاز شراب کا حکم بیان کرنے سے نہیں ہوتا اور نہ یہ مزدوری ہے کہ ایمان لانے کے لیے ہر حال میں ترک شراب کی شرط لگائی جائے۔ ترک شراب اگر پہلے مرحلہ میں ممکن نظر نہ آئے تو اس کو دوسرے مرحلہ کے لیے موخر کیا جاسکتا ہے۔ یہاں ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ شراب کے بارے میں رخصت اس وقت تک تھی جب تک اس کے بارے میں واضح حکم قرآن میں نہیں آیا تھا۔ اب جب کہ شراب کی حرمت کا واضح حکم آچکا ہے تو اب یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک حرام کی ہوئی چیز کے بارے میں کسی کو رخصت دی جائے مگر یہ استدلال صحیح نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے دعوتی مصالح کے تحت بعض احکام میں لوگوں کے ساتھ وقتی طور پر نرمی اور رخصت کا طریقہ اختیار فرمایا۔ اس کی ایک واضح مثال قبیلہ ثقیف کا معاملہ ہے۔ قبیلہ ثقیف (طائف) کا وفد رمضان ۳ھ میں مدینہ آیا اور اسلام قبول کیا۔ انھوں نے قبول اسلام کے لیے یہ شرط لگائی کہ وہ زکوٰۃ نہ دیں گے اور جہاد نہیں کریں گے۔ اس وقت زکوٰۃ اور جہاد کا حکم واضح طور پر قرآن میں آچکا تھا۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شرطوں کو منظور کر لیا، اور فرمایا کہ بعد کو وہ خود ہی اس پر بھی عمل کریں گے۔ اس سلسلہ میں ابوداؤد کی ایک روایت یہاں نقل کی جاتی ہے:

من وھب، سألت جابراً عن شأن ثقیف  
اذبايعت۔ قال: اشتراط علی رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم ان لا صدقة علیہا  
ولاجھاد، وانہ سمع رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم یقول بعد ذالک: "سیتصدقون  
ویجاہدون اذا اسلموا۔"  
سیرة ابن کثیر، جلد ۳، صفحہ ۵۶

وہب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر سے ثقیف کے معاملہ میں پوچھا جب کہ انھوں نے بیعت کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ثقیف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرط لگائی کہ ان پر زکوٰۃ نہ ہوگی اور نہ ان پر جہاد ہوگا۔ اور یہ کہ انھوں نے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: جب وہ اسلام قبول کریں گے تو آئندہ وہ زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔

اسلام کے مستقل احکام وہی ہیں جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں۔ یہ احکام بلاشبہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر مطلوب ہیں۔ مگر مخصوص حالات میں کسی شخص کے ساتھ وقتی طور پر رخصت اور رعایت کا طریقہ اختیار کرنا بھی خود اسلام ہی کا تقاضا ہے۔

دعوت کے معاملہ میں خاص طور پر اس کا بہت زیادہ لحاظ کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں کسی شخص یا قوم کا داخلہ ایک تدریجی عمل ہے۔ حکمت و دعوت اسی تدریج کو ملحوظ رکھنے کا دوسرا نام ہے۔ رسول اور اصحاب رسول نے اسی تدریج کی حکمت کو اختیار کر کے ایک عالم میں اسلام کو پھیلا دیا۔ بعد کے زمانہ میں جب مسلمان اس حکمت کو بھول گئے تو اسلام کی اشاعت کا کام بھی رک گیا۔

## فرانس میں اسلام

اسلام فرانس میں تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ پورے ملک میں کثرت سے مسجدیں بن رہی ہیں۔ فرانس کے وزیر داخلہ چارلس پاسکانے اپنے علم کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس نئے اور عجیب منظر پر ایک رپورٹ تیار کر کے انھیں دیں جس کو انھوں نے "ہزار مسجدوں کا فرانس" کہا ہے۔ پندرہ سال کے اندر فرانس میں مسجدوں کی تعداد ایک درجن سے ایک ہزار تک پہنچ گئی ہے۔

علم سیاست کے پروفیسر گلین کیل کی ایک نئی کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "مضافات اسلام"۔ اس میں انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ اس مغربی ملک میں ایک "اسلامی فرانس" وجود میں آرہا ہے۔ اس کے مطابق، فرانس میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً تین ملین ہے۔ ۳۲ سالہ پروفیسر کیل کا کہنا ہے کہ ابھی تک یہ بات غیر واضح ہے کہ فرانس کے مسلمان ایک روز یہاں کے قومی دھارے میں ضم ہو جائیں گے یا نہیں۔ اکثر مبصرین کا خیال ہے کہ فرانس کی سوسائٹی اور اس کا کلچر اتنا طاقتور ہے کہ مسلمان دھیرے دھیرے یہاں کی سوسائٹی میں ضم ہو جائیں گے۔ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہاں کے مسلمان اپنی شناخت کو محفوظ رکھیں گے اور کیتھولک، پروٹسٹنٹ یا یہود کی طرح ایک علیحدہ فرقہ بن کر باقی رہیں گے۔

فرانسیسی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت شمالی افریقہ کی سیاہ نام نسل سے تعلق رکھتی ہے جو یا تو مہاجر ہیں یا پاسپورٹ پر یہاں رہ رہے ہیں۔ کچھ ترک مسلمان ہیں۔ صرف سٹھی بھرایسے لوگ ہیں جو اصلاً فرانسیسی ہیں اور مذہب تبدیل کر کے مسلمان بنے ہیں۔ فرانسیسی مسلمان زیادہ تر غریب طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں بہت سے ہیں جو بالکل جاہل ہیں۔

فرانس یورپ کا اہم ترین ملک ہے۔ فرانس جیسے ملک میں تین ملین مسلمانوں کا اجتماع انھیں مغربی دنیا میں اسلام کی دعوت و اشاعت کا زبردست موقع دے رہا ہے۔ مگر دعوتی ذہن نہ ہونے کی وجہ سے ان کی ساری توجہ صرف اس پر لگی ہوئی ہے کہ اس مغربی ملک میں وہ اپنی گروہی شناخت کو باقی رکھ سکیں۔ دعوت و تبلیغ کا ذہن آدمی کے اندر آفاقیت پیدا کرتا ہے اور قومی شناخت کا ذہن صرف محدودیت۔

# Islam in France

By Hanspeter Oswald

## PARIS :

Islam has made huge strides in France, with mosques spreading across the landscape and increasingly self-assured Muslims demanding recognition that this is now a partly Muslim country. Interior Minister Charles Pasqua has instructed his staff to prepare him a report on this strange new "France of the Thousand Mosques" detailing the influence of Islamic fundamentalists. The newspaper and broadcasting have also discovered the "Islamic French" thanks to a major new book by a specialist in Islamic studies and political science professor, Gilles Kepel.

The book, *Islam's Suburbs* surveys a Muslim community of about 3 million that has often been the target of racism. The numbers have not grown for 15 years, but Muslim consciousness has sharply altered. Kepel, 32, says it is still unclear whether French Muslims will one day be integrated into mainstream French society or simply insert themselves as a foreign body between its folds. But nobody ought to imagine French Muslims will just disappear. Many commentators on the book claim assimilation is inevitable. They say French society and culture is so powerful that even the most radical Muslims will little by little be absorbed. The sceptics prefer the insertion scenario, predicting that Muslims will form their own lobby with spokesmen and institutions that will eventually extract the same sort of recognition from the state enjoyed by Catholics, Protestants and Jews.

That has a catch. As a tolerant Western society, France will readily allot a niche to the purely religious aspects of Islam. But a conflict is in the making over Islam's vision of society and its political implications. The majority French favour a secular state and reject all religious influence on state affairs.

The huge majority of French Muslims are from North Africa and Muslim regions of Black Africa, either migrant workers or holders of French passports. Some are from Turkey. Only a handful are converts of purely French descent.

The bulk of the faithful who bow towards Mecca at the Grand Mosque de Paris in the Rue Jean-Pierre Timbaud are underprivileged outsiders clad in cheap clothes — mostly manual workers, many unable to read or write some have never attended any school. Well-off Muslims worship more discreetly or do not turn up for prayers at all, but they provide the cash that makes the flowering of Islam possible. A look at the bell-pushes in the plush West End of Paris shows plenty of residents of Arab extraction. Backing up their contributions are donations from Gulf Arab foundations or from the Islamic Republic of Iran. The flow of cash has ensured that most Muslims have a place of prayer near at hand.

In just 15 years the number of mosques and places of prayer has grown from just a dozen or so in the whole of France to 1,000. There are a total of 635 Islamic congregations or organisations incorporated under French law. The teachers of this new breed of Islam run the gamut from anti-Western militants to advocates of tolerance, but few preach a distinctively French form of Islam. Kepel sets out the choices in his book but does not predict which will win the day.

He says the anti-Western advocates of isolation from mainstream France are currently making the loudest pitch. They find a ready ear among migrants ill at ease among the French, unable to speak the French language properly and chary of becoming integrated. The petty racism of day-to-day life in the midst of Christendom drives many such Muslims to take comfort in their religion.

Kepel's book contains many interviews showing that elderly people rediscover their sense of dignity in Islam and try hard to convey that sense to their children. Younger Muslims mostly identify with Islam but do not regard it as a contradiction to their Western lifestyle. Girls in Muslim families absorb French mores and behaviour more readily than any other group. Kepel proposes as the best solution that the French state take the initiative and try to integrate Muslims into mainstream life. He says that the minds and hearts of the Muslims will mainly be won in the schools, where the next generation is growing up. (DPA-Feature)

*The Hindustan Times*, December 11, 1987

## جاپان میں اسلام

جاپان میں بدھزم کا آغاز اس طرح ہوا کہ کوریا کے راجہ نے شاہ جاپان (یماٹو) کو ۵۳۹ء میں ایک تحفہ بھیجا۔ یہ تحفہ دو چیزوں پر مشتمل تھا: گوتم بدھ کا مجسمہ اور ان کی تعلیمات کا ایک مختصر صحیفہ۔ کوریا کے راجہ نے لکھا کہ یہ سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ جو میں آپ کو بھیج سکتا ہوں۔ اس طرح بدھزم ایک مذہبی تحفہ کی شکل میں چھٹی صدی عیسوی میں جاپان میں داخل ہوا۔ اور تھوڑے دنوں بعد شہزادہ شوٹو کو (۶۲۱ء-۵۷۴ء) کے زمانہ میں جاپان کا سرکاری مذہب بن گیا۔

(دین اینڈ ہرگاڈ Man and his God)

غیب بات ہے کہ یہی واقعہ اب سے چاسی برس پہلے جاپان میں اسلام کے ترقی میں پیش آیا۔ مزید اس اضافہ کے ساتھ کہ اس بار شہنشاہ جاپان نے خود ہی فرمائش کی تھی کہ اسلام کو اس کے ملک میں بطور تحفہ بھیجا جائے۔ یہ ۱۸۹۱ء کا واقعہ ہے جب کہ عالم اسلام میں بے شمار بڑی بڑی شخصیتیں موجود تھیں۔ مگر اس پیش کش کے جواب میں کچھ نہ کیا جا سکا۔ حالانکہ اگر بروقت اس سے فائدہ اٹھایا جاتا تو آج نہ صرف جاپان بلکہ شادیاں ایشیا کی تاریخ دوسری ہوتی۔

جاپان کا پرانا توہمی مذہب شنتو ہے۔ مگر اس کی کوئی مقدس کتاب نہیں۔ یہ مذہب سے زیادہ توہمی روایات کا ایک مجموعہ ہے۔ کنفیڈیشن مذہب تیسری صدی میں چین سے اور بدھ مت چھٹی صدی عیسوی میں کوریا سے جاپان آئے۔ جاپان کی بیشتر آبادی انھیں تینوں مذاہب کو مانتی ہے۔ سولہویں صدی کے نصف آخر میں عیسائی مذہب پرتگیزیوں کے ذریعے جاپان میں داخل ہوا، اور بہت سے جاپانیوں کو مسیحی بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر یہ پرتگیزی استعماری ذہن کے تحت جاپان میں داخل ہوئے تھے۔ مذہب کی آڑ میں انھوں نے جاپان کی سیاست پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ چیز جاپانیوں کو بے حد ناگوار تھی۔ پہلا پرتگیزی مشنری فرانسس زیویر ۱۵۴۹ء میں جاپان میں داخل ہوا تھا۔ اس کے پچاس سال بعد مسیحیوں کے خلاف جاپان میں داروگیر شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ ۱۶۱۲ء میں ایک سخت فرمان جاری کیا گیا جس کے مطابق نہ کوئی مسیحی باہر سے آسکتا تھا اور نہ جاپان کا کوئی شہری مسیحی مذہب اختیار کر سکتا تھا۔ اس کے بعد ہزاروں عیسائی قتل کر دیئے گئے۔ ہزاروں نے عیسائیت کو چھوڑ کر دوبارہ اپنے آبائی مذہب کو اختیار کر لیا۔ عیسائیت کے مقدس نشان صلیب اور مسیح دہریم کے مجسموں کو توڑ ڈالا گیا۔ ۱۸۵۳ء تک عیسائیت کو جاپان سے بالکل ختم کر دیا گیا تھا۔

مگر ٹھارویں صدی میں یورپ میں جو فکری انقلاب آیا اس نے صورت حال کو دوبارہ مغرب کے موافق کر دیا۔ اس صدی میں یورپ نے سیاسی اور سماجی علوم کی از سر نو تدوین کی۔ اس نے ثابت کیا کہ فرد کی آزادی وہ سب سے بڑی چیز ہے جو کسی سماج یا ریاست کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس فکری سیلاب نے ساری دنیا میں ان لوگوں کو دفاع کی پوزیشن میں ڈال دیا جو فرد کی آزادی کو ختم یا محدود کر کے اپنا سماجی نظام بناتے ہوئے تھے۔

ایسی تمام قومیں اپنے حق میں استدلال کی طاقت سے محروم ہو گئیں، ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ مغرب کے فکری یلغار کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔

شہنشاہ میجی کے عہد سلطنت (۱۹۱۲ - ۱۸۶۸) میں ایک طرف جاپانی مشہروں کی تعمیر کے لئے یورپ اور امریکہ کے عمارتی نقشے درآمد ہونا شروع ہوئے۔ دوسری طرف وہاں کے نظریات و افکار بھی جاپان پہنچے جن میں آزادانہ رائے کا نظریہ سرفہرست تھا۔ اس کے اثر سے سابق فیصلے پر نظر ثانی ہونے لگی۔ ۱۸۷۳ء میں خلاف سحریت قانون کو منسوخ کر دیا گیا۔ ۱۸۸۹ء میں مغربی طرز کا دستور بنا جس میں جاپانیوں کے لئے نہرہمی آزادی کا اعلان کیا گیا۔ اب پھر یورپ اور امریکہ کے عیسائی مشنری جاپان پہنچنے لگے اور عیسائیت کی تبلیغ دوبارہ شروع ہوئی۔ تاہم بے پناہ سرمایہ خرچ کرنے کے باوجود عیسائی مذہب اختیار کرنے والوں کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ نہ ہو سکا۔

زمانہ کے فکری دباؤ کے تحت قانون میں تبدیلی تو ہو گئی۔ مگر جاپان کے ہوش مند لوگ اب بھی خائف تھے کہ عیسائیت کو تبلیغ کی آزادی دینا ملک میں مغربی استعمار کے داخلہ کا سبب بن جائے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر میں جب عیسائیت کے خلاف قانون کو ختم کیا گیا اسی زمانہ میں حکومت جاپان نے کچھ ایسی حفاظتی تدبیریں بھی کیں جن سے عیسائیت کو سیاسی خطرہ کی حد تک جانے سے روکا جاسکے۔ انھیں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شہنشاہ جاپان (مہمی) نے ۱۸۹۱ء میں ترکی خلیفہ سلطان عبدالحمید ثانی (۱۹۱۸ - ۱۸۴۲) کے نام ایک خصوصی مکتوب روانہ کیا۔ اس نے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے سلطان ترکی کو لکھا تھا: ”ہم دونوں مشرقی بادشاہ ہیں۔ ہماری (اور ہماری قوم کی) مصلحت یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوں۔ اور ملتے ہیں۔ اور ہم دونوں کے درمیان تعلقات مضبوط ہوں تاکہ ہم مغربی قوموں کا مقابلہ کر سکیں جو تمام مشرقی سلطنتوں کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے یہاں مذہبی آزادی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر مغربی قومیں اپنا مذہب پھیلانے کے لئے جاپان میں اپنے مبلغین بھیج رہی ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ لوگ ایسا نہیں کرتے۔ ہم پسند کریں گے کہ آپ اپنے مبلغین یہاں بھیجیں جو آپ کا مذہب اسلام یہاں کے لوگوں کو بتائیں۔ اس طرح امید ہے کہ آپ کے اور ہمارے درمیان سنوئی رشتہ قائم ہوگی۔“

شہنشاہ جاپان کی طرف سے خط ملنے کے بعد سلطان عبدالحمید نے شیخ الاسلام، ناظر المصنف اور دوسرے علماء اڈ اہل فکر کو جمع کیا اور پوچھا کہ اس معاملہ میں کیا کیا جائے۔ لوگوں نے رائے دی کہ آستانہ (ترکی) میں جو اسلامی مدارس ہیں ان سے کچھ علماء منتخب کئے جائیں اور ان کو جاپان بھیجا جائے، اس مجلس میں سید جمال الدین افغانی (۱۸۴۶ - ۱۸۳۸) بھی شریک تھے۔ آخر میں سلطان نے کہا کہ آپ بھی اپنی رائے دیں۔ انھوں نے کہا: یہ علماء تو خود مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ بچہ وہ جاپانیوں کو اسلام سے قریب کرنے کا سبب کیسے بنیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو باقاعدہ تربیت دے کر تیار کیا جائے جو موجودہ زمانہ کی رعایت سے اسلام کی تبلیغ کی خصوصی صلاحیت رکھتے ہوں۔ پھر ان کو جاپان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے بھیجا جائے۔ اس وقت سلطان صرف یہ کریں کہ

میکاڈو (شہنشاہ جاپان) کے جواب میں شکرہ کا خط بھیج دیں اور یہ لکھ دیں کہ آپ کی رائے بہت مناسب ہے۔ ہم پہلے ہی اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ سلطان نے کچھ تحفہ تحائف کے ساتھ ایک خط شہنشاہ جاپان کو بھیج دیا۔ (حاضر العالم الاسلامی، از امیر شکیب ارسلان)

فرانسس زیوریر (۱۵۵۲-۱۵۰۶) جب ۱۵۴۹ میں گوا سے جاپان پہنچا تو مخالف حالات کے باوجود اس نے جاپانی زبان سیکھی اور مسیحیت کی تبلیغ شروع کی۔ مگر موافق حالات کے باوجود عالم اسلام میں کوئی جاپانی زبان سیکھنے کے لئے نہ اٹھا۔ سید جمال الدین افغانی اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کام کے لئے موزوں ترین شخص تھے۔ سلطان عبدالحمید ان سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ اگر وہ سلطان سے کہتے کہ آپ ایک ادارہ قائم کر دیجئے۔ میں اس کو چلاؤں گا اور اس میں جاپانی زبان میں اسلامی کتابوں کے ترجمے اور جاپان میں تبلیغ کرنے والے افراد تیار کروں گا تو سلطان فوراً راضی ہو جاتا۔ مگر جمال الدین افغانی کو اپنے سیاسی مشاغل سے فرصت نہ تھی۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا کام یہ تھا کہ انگریزی اور فرانسیسی استعمار کو قبر میں اتار دیا جائے، وہ مغربی قوموں کا سیاسی اقتدار ختم کرنے کے لئے بے چین تھے۔ ایسی حالت میں کفر و شرک کو دنیا سے ختم کرنے کی بے چینی ان کے اندر کس طرح پرورش پاتی۔

## How England was Lost to Islam?

Had powerful Moorish ruler Emir Mohammed Al-Nassir overlooked the fact that Islam forbids taking undue advantage of helpless people, England would have become a Muslim country in the 13th century—some 800 years ago.

Gabriel Ronay in his book "The Tartar Khan's Englishman" published by Cassel, disclosed that in 1213 King John of England sent a secret emissary of three persons to Moorish ruler Emir Mohammed Al-Nassir with offer of homage and promise that if England were to be received into the Arab fold King John would become the Emir's tribute-paying vassal and he along with his subjects convert to Islam.

Ronay came across verbatim account of secret emissary while researching for book on Robert Dad, London Catholic priest who was also one of the emissary sent to Al-Nassir and who was later excommunicated and banished from England by King John for his role in the Magna Carta rebellion of 1215.

This forgotten episode of English history when King John offered to become Muslim along with his subjects was dutifully recorded by Saint Alban's chronicler of 13th century, Mathew Paris. There is little to question veracity of his account writes Ronay, because he heard it straight from those emissaries.

Nasser's Rebuff: Baron Thoma Hardington, head of King John's emissary, according to Paris accounts, was instructed by John to tell Emir Al-Nassir "great King of Africa, Morocco and Spain that he would voluntarily give up to him, himself and his kingdom, and if he pleased, would hold it as tributary for him and that he would also abandon Christian faith which he considered false and would faithfully adhere to the law of Mohammed".

Baron Hardington, who was accompanied by Baron Relph Fitznicholas and Catholic priest Master Robert de London handed King John's letter to the Emir and with the aid of an interpreter proceeded to convey with oratorical skill the richness of England's soil, fertility of its fields and skill of its people "who are handsome and ingenious, are skilled in three languages, Latin, French and English as well as in every liberal and mechanical pursuit".

Ronay describes Emir's reply as "exceptionally level headed" when he said, "I have never read or heard that any king possessing such prosperous kingdom, subject and obedient to him, would thus voluntarily ruin his sovereignty by making tributary to a country that is free by giving to a stranger that which is his own by turning happiness to misery and thus giving himself up to will of another conquered as it were without wound".

Upon his emissary's return to England, King John "wept bitterly in being balked in his purpose".

Catholic priest, Master Robert de London later was excommunicated and banished from England as a result of his role in Magna Carta rebellion. He went to Mongolia to become Tartar Khan's chief diplomat and later to return to Europe eventually as head of the Tartars that converted nearly half of Europe to Islam.

**SUNDAY TIMES** (London) October 22, 1978

## England could be a Muslim Country

It will come as a shock to anyone affected by the present-day Arab invasion of Lond—but for a crucial moment in the thirteenth century England faced the prospect of being totally converted—lock, stock and barrel—into a Muslim country.

In 1213, in a demented move of desperation, King John Lackland sent a secret embassy of three people to Emir Mohamed al-Nassir, the powerful Moorish ruler, with an offer of homage and the promise that, if England were to be received into the Arab fold, he would become the emir's tribute-paying vassal. John sought conversion to Islam as a way out of pressing political problems.



I came across a verbatim account of the secret embassy in a contemporary monastic chronicle, while researching a book on Robert de London, a Catholic priest who was ex-communicated and banished from England for his role in the Magna Carta rebellion.

This virtually forgotten episode of English history was dutifully recorded by Matthew Paris, a shrewd St Albans chronicler of thirteenth-century events. There is little reason to question the veracity of his account because he heard it straight from the horse's mouth.

According to Paris, the three-man embassy was composed of the barons Thomas Hardington and Ralph FitzNicholas, and Master Robert de London. Paris offers no explanation for the inclusion of the London priest but one likely reason is that John charged Master Robert, "the king's own cleric," to ensure the barons did not double-cross him.

Thomas Hardington, the head of the embassy, was instructed by John to tell "the great king of Africa, Morocco and Spain that he would voluntarily give up to him, himself and his kingdom, and if he pleased would hold it as tributary for him; and that he would also abandon the Christian faith, which he considered false, and would faithfully adhere to the law of Mohammed."

With that he handed King John's letter to the emir and, with the aid of an interpreter, proceeded to convey with oratorical skill the richness of England's soil, the fertility of its fields and the skills of its people "who are handsome and ingenious, are skilled in three languages—Latin, French and English—as well as in every liberal and mechanical pursuit."

The Moorish ruler's reply was exceptionally level-headed: "I have never read or heard that any king possessing such a prosperous kingdom subject and obedient to him, would thus voluntarily ruin his sovereignty by making tributary a country that is free, by giving to a stranger that which is his own, by turning happiness to misery and thus giving himself up to the will of another, conquered as it were without a wound."

After a typically Muslim appraisal of John's manliness, the emir refused the offer to embrace Islam "for he is a petty king, senseless and growing old...and unworthy of an alliance with me." And he told his envoys never to come into his presence again.

Upon the embassy's return to England, King John "wept with bitterness in being balked in his purpose." Perhaps believing that his barons had double-crossed him, he put the London priest in charge of the whole St Albans Abbey as a reward. His stewardship soon ended, however, because the monks bribed the king with 700 silver marks to have him removed.

Master Robert then crossed over to the barons' camp, fighting for a charter of rights. He was excommunicated and banished from England as a result of his role in the Magna Carta rebellion and was swept by the tide of events from London to the steppes of Mongolia, where he became the ferocious Tartar Khan's chief diplomat. He returned to Europe eventually at the head of the Asiatic hordes bent on the annihilation of our continent.

GABRIEL RONAY

(The Tartar Khan's Englishman was published last week by Cassel.)

SUNDAY TIMES (London) October 22, 1978

سلطنت موحیدین کا حوصلہ مند فرماں روا عبدالملک اندلس پر اپنے قبضہ کو مکمل کرنے کے بعد سارے یورپ کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی عمر نے وفات کی۔ وہ پانچ لاکھ کے ناقابل تسخیر لشکر کو لے کر آگے بڑھنے والا تھا کہ جمادی الثانی ۵۵۸ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ تاہم اس کی اگلی پشت میں (امیر ابو عبد اللہ محمد ناصر لدین اللہ کے زمانہ حکومت ۶۱۰-۶۹۵ھ) میں خود یورپ کی سیاست نے اس خواب کی تکمیل کے اسباب پیدا کر دیئے۔ اگرچہ ناصر لدین اللہ کی کم ہمتی کی وجہ سے یہ خواب تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

اس زمانہ میں جان لاک لینڈ (۱۲۱۶-۱۶۱۶) انگلستان کا بادشاہ تھا۔ یہی وہ بادشاہ ہے جس نے مشہور میگنکارٹا (منشور آزادی) پر ۱۲۱۵ میں دستخط کئے تھے۔ اس کے زمانہ میں ملک کے کچھ امرا نے اپنے حقوق کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ امرا اور بادشاہ کے درمیان کش مکش برپا ہوئی۔ پوپ انوسٹ سوم (۱۲۱۶-۱۱۶۰) نے اس معاملہ میں امرا کا ساتھ دیا۔ لندن کا پادری رابرٹ، جو اس مقابلہ میں بادشاہ کے ساتھ تھا، پوپ نے اس کو کلیسا سے خارج کر دیا۔ ان حالات میں شاہ جان نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ اندلس کے مسلم حکمران کا تعاون حاصل کر کے اپنے حریفوں کو شکست دے۔ اس نے ۱۲۱۳ء میں ناصر لدین اللہ کے پاس ایک خفیہ سفارت بھیجی۔ اس سفارتی وفد کے ارکان یہ تھے: جماس ہارڈنگٹن، رالف فرنگکوس، ماسٹر رابرٹ۔ یہ وفد سمندری سفر کر کے مراکش پہنچا جہاں ناصر لدین اللہ مقیم تھا۔ وفد کے ارکان وسیع محل کے ایوان اور دروازوں سے گزرتے ہوئے، جن کے دونوں طرف شاہی خدام کی صفیں کھڑی ہوئی تھیں، امیر ناصر لدین اللہ کے سامنے پہنچے۔ انھوں نے امیر کو شاہ جان کا خط پیش کیا اور ترجمان کے ذریعہ امیر سے گفتگو کی۔ اپنے بادشاہ کی ہدایت کے مطابق انگلستانی وفد نے ناصر لدین اللہ سے کہا کہ اگر آپ شاہ جان کی مدد کریں تو وہ آپ کے باج گزار بن جائیں گے۔ نیز یہ کہ عیسائیت پر ان کا اعتقاد ختم ہو گیا ہے اور وہ "افریقہ اور مراکش اور اسپین کے عظیم بادشاہ" کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہیں اور اس کے ساتھ ان کی رعایا بھی۔ وفد نے انگلستان کی تعریف میں مزید کہا کہ وہ ایک زرخیز ملک ہے۔ اس کے باشندے تین زبانوں کو جانتے دالے ہیں: لاطینی، فرانسیسی اور انگریزی۔ وہ مختلف قسم کی فنی صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں۔

امیر ناصر لدین اللہ نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ اس نے اس کو سیاسی چال سمجھا۔ اس نے کہا "میں نے کبھی نہیں سنا کہ کوئی بادشاہ جس کے پاس اتنا قیمتی ملک ہو، خود سے اپنے آپ کو دوسرے بادشاہ کے حوالے کر دے"۔ اس نے وفد کے لوگوں کو اپنے دربار سے نکال دیا اور کہا کہ اب کبھی میرے پاس نہ آنا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے گیرمل روڈ نے لکھا ہے:

"تیرھویں صدی عیسوی میں انگلستان مکمل طور پر ایک مسلم ملک بن جاتا اگر ناصر لدین اللہ شاہ جان کی پیش کش کو قبول کر لیتا"۔

شاہ انگلستان کے اسلام کو قبول نہ کرنا ناصر لدین اللہ کے لئے جھنگا بڑا۔ ۶۰۹ھ میں یورپی فوجیں بہت بڑی تعداد میں شاہ اٹھانوے کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر مسلم اندلس پر حملہ آور ہوئیں۔ ناصر لدین اللہ کے ساتھ چھ لاکھ کاشکرتھا۔ مگر امیر کی تارگی کی وجہ سے اس کو بری طرح شکست ہوئی۔ بیشتر مسلم فوجی العقاب کے میدان میں عیسائیوں کے ہاتھوں مار ڈالے گئے۔ ایک عظیم امکان ایک بہترین انجام میں تبدیل ہو گیا۔

## فطرت انسانی

لاہور کے اردو روز نامہ نوائے وقت کے شمارہ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۳ء میں ایک خبر چارسطری سرخیوں کے ساتھ چھپی ہے۔ اس میں بہت سبق ہے۔ وہ خبر نوائے وقت کے الفاظ میں یہ ہے:

سابق سوویت یونین کے تین جنگی قیدیوں نے رہائی کے بعد افغانستان سے اپنے وطن واپس جانے سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ افغانستان میں ہی قیام کرنا چاہتے ہیں۔ ان جنگی قیدیوں کو افغانستان کے وزیر اعظم گلبدین حکمت یار اور روسی وزیر خارجہ کے درمیان ہونے والی بات چیت کے بعد پہلے مرحلے میں رہائی ملی۔ بی بی سی کے مطابق ان تین قیدیوں میں سے ایک کا تعلق یوکرین اور دو کا تعلق روس سے ہے۔ رہائی پانے والے ان مذکورہ افراد کا کہنا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے بے حد متاثر ہوئے ہیں اور اسلام کی محبت سے معمور ہو کر اپنی باقی زندگی افغانستان میں ہی گزارنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اس فیصلہ سے افغانستان میں روس کے ناظم الامور کو آگاہ کر دیا ہے۔ جنھوں نے گزشتہ روز شمالی افغانستان میں ان سے ملاقات کی۔ روسی ناظم الامور اپنی ہر ممکن کوشش کے باوجود انھیں وطن واپس جانے پر تامل نہ کر سکے۔ اس مرحلہ پر روس کے ناظم الامور نے افغان وزیر اعظم حکمتیار سے بھی وائریس پر بات کی لیکن افغان وزیر اعظم نے انھیں جواب دیا کہ رہائی پانے والے قیدی اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کریں گے۔ رہائی پانے والے روسی قیدیوں کا کہنا ہے کہ قید کے دور ان سے قیدیوں والا نہیں بلکہ مجاہدین گروپوں کے ارکان جیسا سلوک کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ حکمتیار گروپ کی قید میں رہے۔ افغانستان میں سابق سوویت یونین کے مزید ۸۰ جنگی قیدی موجود ہیں۔

اس خبر پر غور کیجئے۔ جب تک روسی فوج اور افغانی فوج میں جنگ ہو رہی تھی، دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ مگر جب دونوں کے درمیان لڑائی بند ہو گئی اور امن کے حالات میں دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع ملا تو دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔ حتیٰ کہ روسی فوجی نے اسلام قبول کر لیا۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر آدمی اسی دین فطرت پر پیدا ہوا ہے۔ کوئی آدمی صرف غیر متعادل حالات میں ہی اپنی فطرت سے بیگانہ ہو سکتا ہے۔ حالات میں اعتدال آتے ہی ہر آدمی اپنی فطرت کو پہچان لے گا اور فطری دین کو اپنا دین بنا لے گا۔

## فتح اسلام

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ مکہ کے مخالفین نے مشورہ کیا کہ اپنے اندر کے ایک سمجھ دار شخص کو جنس بنا کر وہ پیغمبر اسلام کے پاس جا کر ان سے گفتگو کر کے انہیں قائل کر سکے۔ اس مقصد کے لیے ابوالولید عتبہ بن ربیعہ کا انتخاب کیا گیا جو مکہ کے سرداروں میں سے نٹھا اور نہایت ذہین اور ہوشیار آدمی سمجھا جاتا تھا۔

عتبہ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ سے تفصیلی گفتگو کی۔ اس گفتگو کے آخر میں پیغمبر اسلام نے عتبہ کو قرآن (حم السجدہ) کی ابتدائی آیتیں سنائیں۔

روایات بتاتی ہیں کہ عتبہ اپنا دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا اور حیرت اور خاموشی کے ساتھ قرآن کی آیتیں سنتا رہا۔ اس کے بعد عتبہ وہاں سے واپس ہوا تو حسب وعدہ اپنے ساتھیوں کے پاس نہیں گیا، بلکہ اپنے گھر پر بیٹھ گیا۔ ابوجہل کو معلوم ہوا تو اس کو اندیشہ ہوا کہ عتبہ شاید محمد کے کلام سے متاثر ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عتبہ کے گھر گیا۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم اے عتبہ، ہم تمہارے پاس صرف اس لیے آئے ہیں کہ ہم کو اندیشہ ہے کہ تم محمدؐ کی طرف مائل ہو گئے اور محمدؐ کا دین تم کو پسند آ گیا (واللہ یا عتبہ ما جئنا الا انک صبیوت الیٰ محمدؐ واعجبک امرہ، صفحہ ۵۰۲)

اس سلسلہ میں کافی تفصیل سیرت کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ عتبہ نے کہا کہ خدا کی قسم، اس آدمی کی زبان سے میں نے ایسا کلام سنا جیسا کلام میرے کانوں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ اس کو سن کر میں اتنا مسرور ہو گیا کہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کا کیا جواب دوں (واللہ لقد سمعت من هذا الرجل کلاما ما سمعت اذناہی کلاما مثله وما دریت ما اُرِدُّ علیہ، صفحہ ۵۰۵) سیرۃ ابن کثیر، المجلد اول۔

اسلام کی پودہ سو سال کی تاریخ میں مسلسل ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں جب کہ ایک شخص کسی دوسرے مقصد کے تحت اسلام سے قریب ہوا۔ مگر جب اس نے اسلام کی تعلیمات کو جانا تو اس کے دل نے اس کی سچائی پر گواہی دی، اور اس نے خود اپنے جذبہ کے تحت اسلام

قبول کر لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص اسلام سے قریب ہوتا ہے تو وہ عین اپنی اندرونی فطرت کے زور پر اسلام کی طرف کھینچ اٹھتا ہے اور اس کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

ایسے واقعات ماضی میں بھی کثرت سے پیش آئے، اور حال میں بھی کثرت سے پیش آ رہے ہیں۔ الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶ میں اس قسم کا ایک واقعہ جاپان سے متعلق شائع کیا گیا تھا۔

مسٹر سبورو ایک جاپانی پروفیسر تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ جاپانی انسائیکلو پیڈیا کے لیے اسلام پر ایک آرٹیکل تیار کریں۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا۔ مطالعہ کے دوران ان پر اسلام کی سچائی روشن ہوتی چلی گئی۔ ان کے دل نے گواہی دی کہ یہی انسانیت کا حقیقی مذہب ہے۔ یہاں تک کہ جب ان کا آرٹیکل تیار ہوا تو وہ خود بھی اسلام قبول کر کے عملاً اسلام کے دائرہ میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ ۱۹۳۰ کا ہے (صفحہ ۳۲)

اس سلسلہ کی ایک تازہ مثال وہ ہے جو مکہ کے عربی ہفت روزہ اخبار العالم الاسلامی (۲۹ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ، ۲۷ نومبر ۱۹۸۹ء) میں شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک تفصیل رپورٹ ہے جس کا عنوان ہے :

### فشل المخطط الكنسي لإفارقة التنصير

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ عیسائی تنظیموں نے اعلیٰ تربیت کے ذریعہ ۶۳۵۳ مبلغین تیار کیے اور ان کو افریقی ملک لیبیریا کی راجدھانی منروویا (Monrovia) بھیج دیا۔ ان کا مشن یہ تھا کہ وہ خاموش تبلیغ کے ذریعہ لیبیریا (Liberia) کے دس لاکھ مسلمانوں کو مسیحی مذہب میں داخل کر دیں۔

یہ مسیحی مبلغین تمام علمی اور مادی ذرائع سے پوری طرح مسلح تھے۔ ان کو اتنا زیادہ تیار کیا گیا تھا کہ وہ لیبیری قبائل کی مقامی زبانیں، مانکا، بانیکا، منیکا، کیسکا، بلیسکا، نہایت روانی کے ساتھ بولتے تھے۔

ان تمام تیاریوں کے باوجود نتیجہ اٹا ہوا۔ ان مسیحی مبلغین کی بیشتر تعداد نے وہاں پہنچ کر اسلام قبول کر لیا۔ جس ملک میں وہ مسیحیت کی تبلیغ کے لیے بھیجے گئے تھے، وہاں اب وہ

اسلام کی تبلیغ کرنے میں مشغول ہیں۔ انھوں نے بت یا کہ تربیت کے دوران انھیں مختلف مذہبوں کا مطالعہ کرایا گیا تھا، مگر اس نظام کے تحت انھیں اسلام کی صرف مسخ شدہ تعلیمات ہی سے واقف کرایا گیا لیبریا میں جب ان کا سابقہ مسلمانوں سے ہوا تو انھیں موقع ملا کہ وہ اسلام کو زیادہ صحیح صورت میں جان سکیں۔ اس واقعیت کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ عیسائی تنظیموں نے اس مقصد کے لیے ازبلی نسل کے مسیحیوں کا انتخاب کیا تھا تاکہ وہ لیبریا پہنچیں تو وہ وہاں کے لوگوں کو اجنبی نہ دکھائی دیں۔ ان کو بتایا گیا کہ وہ ملک کی قبائلی زبانوں میں مہارت حاصل کریں اور وہاں کے سماج میں گھل مل کر خاموشی کے ساتھ اپنا کام کریں۔ چنانچہ یہ لوگ مسلم آبادیوں کے درمیان غیر محسوس طریقہ پر آباد ہو گئے۔ ان میں بہت سے لوگوں نے لیبریا کی نیشنلٹی کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیا۔ اسی خاص انداز کار کی وجہ سے اس منصوبہ کا نام *افرقۃ السنہیں* رکھا گیا تھا۔

لیبریا کی مسلم تنظیموں کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے شور و غل کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ جوابی تبلیغی عمل شروع کر دیا۔ مثلاً انھوں نے ملک کے مختلف شہروں — فوناما، کاکاتا، سنکولی، کاتیلہ وغیرہ میں اجتماعات شروع کیے اور آل مذاہب کانفرنسیں منعقد کیں۔ ان میں لوگوں کو موقع دیا گیا کہ وہ ہر مذہب کے بارہ میں کھل کر بحث و مذاکرہ کریں۔ ان کانفرنسوں میں مسیحی علماء کو سخت ناکامی ہوئی۔ مسلم علماء کے مقابلہ میں وہ نہ علمی سطح پر اپنا دفاع کر سکے اور نہ دلائل کے ذریعہ اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے۔

دوسری طرف ان کانفرنسوں کے ذریعہ یہ ہوا کہ اسلام کی سچائی اور برتری نمایاں ہو کر سامنے آگئی۔ اس سے ان مسیحی مبلغین میں مایوسی اور ذہنی انتشار پیدا ہوا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنے موجودہ مشغلہ کو اپنی فطرت کی آواز کے خلاف سمجھا۔ وہ عیسائیت کے بجائے اسلام کی مزید تحقیق میں لگ گئے۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت نے قبول اسلام کا اعلان کر دیا۔ جو لوگ مسیحی مبلغ بن کر آئے تھے، وہ اسلام کے مبلغ اور اس کے علم بردار بن گئے۔

جس اسلام کی طاقت اتنی زیادہ ہو، اس کے ماننے والے اگر یہ نعرہ لگائیں کہ اسلام خطرہ میں ہے (Islam is in danger) تو ایسے لوگوں سے زیادہ نادان قوم اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

باب چہارم :

# امکاناتِ دعوت

• 13594

## ابدی امکان

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو امور کائنات کا نظم کر رہا ہے، اور وہ اللہ ہی ہے جو اپنے پیغمبروں کے اوپر اپنی آیتیں نازل کرتا ہے (میدجر الامر بفصل الآيات) ارد ۲

اس سے معلوم ہوا کہ کائناتی واقعات، مثلاً زمین کی گردش یا بارش کا برسا، خدا کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ بھی خدا کے حکم کے تحت ہیں۔ دونوں ہی خدائی مقدرات ہیں۔ کوئی شخص اس پر قادر نہیں کہ وہ زمین و آسمان کے نظام میں تبدیلی پیدا کر دے۔ اسی طرح کوئی اس پر بھی قادر نہیں کہ وہ حیات انسانی کے بارہ میں خدا کے مقرر کیے ہوئے قوانین کو بدل دے۔

حیات انسانی کے بارہ میں قرآن میں جو قوانین بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہاں مسائل ہی مسائل ہوں، اور مواقع کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہو۔ یہاں ہمیشہ ایسا ہو گا کہ جہاں کچھ مشکل ہوگی وہیں آسانیاں بھی اسی کے ساتھ ضرور موجود رہیں گی

(فان مع العسر يسرا۔ ان مع العسر يسرا) الانشراح

کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی طاقتور ہو، اس پر قادر نہیں کہ وہ آپ کے اوپر صبح کے آنے کو روک دے۔ رات کے بعد ضرور صبح آئے گی اور آپ کے گھر کے اوپر اس کی روشنی پھیل کر رہے گی۔ اسی طرح کسی کے بس میں یہ بھی نہیں کہ وہ آپ کو ایسی مشکل میں ڈال دے کہ اس کے بعد آسانی کی کوئی صورت آپ کے لیے باقی ہی نہ رہے۔ یہ خدائی مقدرات میں سے ہے کہ مشکلات راہ کے ساتھ عین اسی وقت مواقع کا بھی آپ کے لیے موجود رہیں۔ یہ خدا کا مقرر کیا ہوا ایک محکم قانون ہے، اور اس کو بدل دینا کسی بھی شخص یا گروہ کے لیے کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مایوسی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ جو آدمی خدا پر یقین رکھتا ہے۔ اس کو اس نظام خداوندی پر بھی محکم یقین رکھنا ہے کہ اس دنیا میں اس کے لیے راہیں کبھی بند نہیں ہوں گی۔ اس کے لیے اس دنیا میں امید کا پہلو ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور جب خدا نے امید کے پہلو کو اتنا زیادہ یقینی بنا دیا ہو تو اس کو یہ بھی حق ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لیے مایوسی کو حرام قرار دے دے۔

## عجیب سرق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے طائف کی طرف جا رہے تھے۔ درمیان میں آپ کا گزر ایک ایسے راستے سے ہوا جو بنظاہر دشوار اور تنگ تھا۔ آپ نے پوچھا کہ اس راستے کا نام کیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ الضیقہ (تنگ)۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، وہ تو ایسوی (آسان) ہے :

ثم سلك في طريق يمتال لها الضيقه - فلما توجه فيها رسول الله صلى الله عليه وسلم سأل عن اسمها - فقال : ما اسم هذه الطريق - فقبل له

الضيقه - فقال : بل هي اليسوي (سيرة ابن هشام، ۱۲۷/۳)

حضرت علیؑ کے یہاں پہلا لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام حرب (جنگ) رکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے اس کو ناپسند فرمایا اور اس کا نام حسن رکھا۔ حضرت علیؑ کے یہاں دوسرے لڑکے کی پیدائش ہوئی تو دوبارہ انھوں نے اس کا نام حرب رکھنا چاہا۔ آپ نے دوبارہ انھیں اس سے منع کر دیا اور لڑکے کا نام حسین تجویز کیا۔ ایک بار آپ کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی۔ آپ نے ان کا نام پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ حزن (غم)۔ آپ نے فرمایا : بدانت سعد نہیں تمہارا نام تو آسان ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک قبیلہ پر ہوا۔ آپ نے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو۔ انھوں نے کہا بنو غیان (مگر انہوں کی اولاد) آپ نے فرمایا : بل انتم بنو رشدان (بلکہ تم ہدایت یافتہ لوگوں کی اولاد ہو) غزوہ ذی قرد کے سفر میں آپ کا گزر ایک کنویں سے ہوا۔ آپ نے کنویں کا نام پوچھا۔ لوگوں نے بتایا کہ بئسان (کھاری) آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ بلکہ اس کا نام نعمان (عمدہ) ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز کا ایک تاریخ پہلو ہوتا ہے، اور دوسرا اس کا روشن پہلو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ہمیشہ چیزوں کے تاریخ پہلو کو نظر انداز کر کے صرف اس کے روشن پہلو کو دیکھتے تھے اور لوگوں کو اسے دکھاتے تھے۔ موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں کا طریقہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ چیزوں کے صرف تاریخ کو دیکھ پاتے ہیں، اس کا روشن رخ ہمیشہ ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ پیغمبر اسلام کے امتی ہیں۔

## عظیم امکان

امریکی میگزین ٹائم (۳ جولائی ۱۹۸۸) کی کور اسٹوری کا موضوع جاپان کی اقتصادی ترقی ہے۔ اس کا عنوان ہے عظیم جاپان Super Japan چار صفحہ کے اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ اقتصادی ترقی کے اعتبار سے اب جاپان کی صدی شروع ہو رہی ہے اور امریکہ کی صدی اب خاتمہ کو پہنچ گئی ہے :

The American century is over (p.4).

مضمون میں مختلف قسم کی تفصیلات دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ بیسویں صدی کے آخر کا سب سے اہم واقعہ جاپان کا سب سے بڑی طاقت (Major superpower) کی حیثیت سے ابھرنے ہے۔ ۱۹۸۸ میں جاپان نے ۱۰ بلین ڈالر بیرونی قرضہ دیا ہے، جب کہ اس کے مقابلہ میں امریکہ کے بیرونی قرضہ کی مقدار ۹ بلین ڈالر ہے۔ آئندہ جاپان ۵۰ بلین ڈالر بیرونی قرضہ دینے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس طرح وہ دنیا کا سب سے بڑا معطلی ملک بن جائے گا۔

ورلڈ بینک کا صدر ہمیشہ صرف امریکہ ہی ہوا کرتا تھا۔ مگر اب جب کہ ورلڈ بینک میں سب سے زیادہ سرمایہ جاپان کا ہے، یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ ورلڈ بینک کا صدر جاپانی ہو۔ پچھلے ۴۰ سال سے امریکہ واحد سب سے بڑی اقتصادی طاقت (Economic superpower) کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب یہ حیثیت تیزی سے جاپان کو ملتی جا رہی ہے۔ جاپان اقوام متحدہ کے بجٹ کا گیارہ فی صد حصہ ادا کر رہا ہے جو امریکہ کے بعد نمبر ۲ پر ہے۔ چنانچہ امریکہ اب اس کی حمایت کر رہا ہے کہ جاپان سیکورٹی کونسل کا چھٹا مستقل ممبر بنا دیا جائے۔

تاہم ان ساری ترقیوں کے باوجود جاپان ایک سنگین مسئلہ سے دوچار ہے۔ اس کے سامنے کوئی واضح مقصد (Clear goal) نہیں۔ جاپان کے پاس ڈیموکریسی یا کمیونزم جیسا کوئی قابل برآمد نظریہ (Exportable ideology) نہیں۔ جاپان کی وزارت خارجہ کے ایک سابق افسر ہڈیاکی کا سے (Hideaki Kase) نے کہا کہ ہمارے پاس کچھ آؤرشس ہونا چاہیے جس میں عالم انسانی کے لیے اپیل ہو :

There must be some ideal that we have that would appeal to mankind (p.5).

مسلمانوں کے نزدیک اب تک "جاپان" کا تصور صرف یہ ہے کہ وہ جاپان کا اکثر انگ مسلمان اور جاپان کی نئی ماڈل کی کار خریدیں اور اس پر فخر کریں۔ حلال کہ جاپان میں ان کے لیے اس سے کہیں زیادہ بڑا امکان چھپا ہوا ہے۔ اب تک وہ جاپان سے صرف "لینے والے" بنے ہوئے تھے، مگر نئے حالات بتاتے ہیں کہ وہ جاپان کے لیے "دینے والے" بن سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے پاس اسلام ہے۔ جو محفوظ دین ہے۔ اس کی تاریخ نے اس کو ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت دیدی ہے۔ جس خدانے انسان کو بنایا ہے، اسی خدانے اس دین کو بھی وضع کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ تمام انسانی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام عین وہی چیز ہے جس کو جاپان اور دوسری قومیں تلاش کر رہی ہیں۔ — صحیح ترین ایڈیٹل جو کسی انسان کو حقیقی تسکین دے، اور جس کے اوپر کوئی قوم حقیقی طور پر کھڑی ہو سکے۔

آج مسلمانوں کے کرنے کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ وہ اسلام کی ربانی دعوت کو لے کر اٹھیں اور اس کو جاپانیوں اور دوسری قوموں کے سامنے پیش کریں۔ موجودہ زمانہ میں اگر کوئی افرض الفراض ہے تو بلاشبہ وہ یہی دعوت ہے۔ مسلمان اگر اس کے لیے اٹھیں تو وہ اپنے لیے ایک عظیم کام پالیں گے۔ دوسروں تک ایک عظیم خدائی تحفہ پہنچانے کا سبب بنیں گے۔

آج کی دنیا میں دعوت اسلامی کے جو عظیم امکانات پیدا ہوئے ہیں، ان کو جاننا اور انہیں استعمال کرنا بلاشبہ مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اگر مسلمان ان مواقع کو استعمال کریں تو وہ دنیا و آخرت میں سب سے بڑی سرزروی حاصل کریں گے۔ اور اگر وہ ان مواقع کو استعمال نہ کریں تو بلاشبہ یہ سب سے بڑا جرم ہے۔ اس کے بعد شدید اندیشہ ہے کہ وہ غضب الہی کے مستحق ہو جائیں۔ اور پھر کوئی بھی چیز نہ ہو جو انہیں اللہ کی پھر سے چسکے۔

## منصوبہ خداوندی

قرآن میں مومنین صالحین کو خیر الہیہ کہا گیا ہے اور ان کے لئے ہمیشہ کی جنت کا وعدہ کیا گیا ہے (ابینہ) یہ کون لوگ ہیں جو اس عظیم فضل کے مستحق قرار پائیں گے۔ ایک لفظ میں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی صفت یہ ہوگی کہ وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ ان سے راضی ہو گیا (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ)، مومن کے اللہ سے راضی ہونے (ورضوا عنہ) کا ایک پہلو خاص شخصی ہے۔ یعنی اپنی ذات کے معاملہ میں اپنی پسند کو محور کر اللہ کی پسند کو اختیار کر لینا۔

اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جو دنیا میں اللہ کے منصوبہ کو جاری کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے ورضوا عنہ کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اپنے آپ کو اللہ کے منصوبہ میں مشاغل کریں۔ وہ اپنے جان و مال کو منصوبہ الہی کی تکمیل میں لگانے پر راضی ہو جائیں۔

اس معاملہ کی پہلی اور کامل مشاغل وہ ہے جو اصحاب رسول نے اپنی قربانیوں سے قائم کی۔ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اللہ کا خاص منصوبہ یہ تھا کہ ایک ایسا انقلاب لایا جائے جس کے بعد صرف عقیدہ توحید کو کھری عظمت حاصل رہے۔ دوسرے تمام عقیدے اور نظریے اپنا کھری جواز کھودیں۔ یہی بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: وقتانلوہم حتی لا تکتون فتنۃ۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے عالمی سطح پر ایک عظیم انقلاب لانا تھا جو صرف عظیم قربانی ہی کے ذریعہ ممکن ہو سکتا تھا۔ صحابہ کرام نے پوری رضامندی کے ساتھ اپنے آپ کو اس منصوبہ الہی میں مشاغل کیا۔ اس میں وہ اس حد تک پورے اترے کہ ان کی زندگی بھی میں ان کے بارے میں اعلان کر دیا گیا کہ رضی اللہ عنہم۔

اس انقلاب کے متلف پہلو تھے۔ اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ خدا کے دین کو ایک تاریخی واقعہ بنا دیا جائے۔ اس سے پہلے ایک سو ہزار سے زیادہ پیغمبر آئے۔ مگر دین خداوندی ایک تسلیم شدہ واقعہ کی حیثیت سے تاریخ میں ریکارڈ نہ ہو سکا۔ صحابہ کرام نے اپنی قربانیوں سے دین خداوندی کو مرحلہ دعوت سے نکال کر مرحلہ انقلاب اور درجہ استقامت تک پہنچا دیا۔

آج دوبارہ اللہ تعالیٰ کا ایک منصوبہ ہے۔ وہ دوبارہ تقاضا کر رہا ہے کہ اہل ایمان اپنے آپ



اشاعت کی جو پیش گوئی فرمائی تھی، اس کا وقت پوری طرح آچکا ہے۔

خدا نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اب اہل ایمان کو اپنے حصہ کا کام کرنا ہے۔ خدا اپنے منصوبہ کے مطابق ضروری مواقع ہیا فرماتا ہے۔ اس کے بعد خدا کے مومن بندے اٹھتے ہیں اور ان مواقع کو استعمال کر کے اس منصوبہ کی تکمیل کرتے ہیں۔

ساتویں صدی میں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ختم نبیؐ کے منصوبہ کے لئے تمام ضروری مواقع بیج کر دیئے تھے۔ رسول اور اصحاب رسول نے ان مواقع کو استعمال کر کے خدا کے منصوبہ کو عملی واقعہ بنا دیا۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں اسلام کی عمومی اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ کا جو منصوبہ ہے، اس کے تمام ضروری اسباب ہیا کر دیئے گئے ہیں۔ خدا نے دوبارہ اپنا کام کر دیا ہے۔ اب خدا کے بندوں کو اٹھنا ہے اور پیدا شدہ مواقع اور اسباب کو استعمال کر کے دوبارہ خدا کے منصوبہ کو عملی طور پر مکمل کر دینا ہے۔

خدا کا دین قرآن کی زبان میں آواز دے رہا ہے کہ **هٰن انصاری الی اللہ**۔ اہل ایمان کو اس کے جواب میں کہنا ہے کہ **نحن انصار اللہ**۔ یہ تاریخ کا نازک ترین لمحہ ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس لمحہ کو پہچانیں اور اپنا سب کچھ اس کی کب آوری میں لگا دیں۔

www.KitaboSunnat.com

## امتیازی صفت

اسلام ایک محفوظ مذہب ہے۔ اس لئے اس کے اندر یہ امتیازی صفت پائی جاتی ہے کہ وہ انسانی عقل اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ عقل غور و فکر یا علمی ترقی کا کوئی بھی درجہ ایسا نہیں جہاں اسلام میں اور عقل میں ٹکراؤ پیش آجائے اور انسان کے سامنے یہ مسئلہ پیدا ہو جائے کہ اگر وہ مذہب کو لیتا ہے تو اس کو علم اور عقل کے تقاضوں کو پہلے چھوڑنا پڑے گا۔

جارج برنارڈش نے اسلام کی اس صفت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب اسلامی اصلاح کی تحریک اٹھی تو اس کے پیروؤں کو یہ زبردست موقع ملا کہ ان کا مذہب دنیا میں واحد قائم شدہ مذہب تھا جس کے عقائد کو کوئی بھی ذہین اور تسلیم یافتہ آدمی تسلیم کر سکتا تھا:

When the Mahomedan reformation took place, it left its followers with the enormous advantage of having the only established religion in the world, in whose articles of faith, any intelligent and educated person could believe.

اسلام کی اسی خاص صفت کا یہ نتیجہ ہے کہ سائنسی دور سے پہلے کے زمانہ میں بھی لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہوتے رہے اور آج سائنسی دور میں بھی ساری دنیا میں لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ ذہن کے لئے اسلام کو قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ یہاں وہ اس مشکل سوال سے دوچار نہیں ہوتا کہ اسلام کو لے تو علم و عقل کو چھوڑنا پڑے گا اور علم و عقل کو لے تو اسلام کو چھوڑنا ضروری ہو جائے گا۔ ایلاہ کہ مصنوعی طور پر وہ اپنے ذہن کے دو خانے بنا لے۔ ایک میں اپنے دین کو رکھے اور دوسرے میں اپنے علم کو۔

جارج برنارڈش نے جس چیز کو دور اول کے اہل اسلام کے لئے عظیم موقع (enormous advantage) کہا ہے وہ موقع آج کے اہل اسلام کے لئے بھی پوری طرح موجود ہے۔ تاہم وہ استعمال نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی راہ میں واحد رکاوٹ وہ قومی نفرت ہے جو داعی اور مدعو کے درمیان غلط طور پر قائم ہو گئی ہے۔ اس رکاوٹ کو اگر دور کر دیا جائے تو دوبارہ اسلام ایک عظیم سیلاب کی مانند انسانی آبادیوں میں داخل ہو جائے گا۔

## دعوہ ہاٹ لائن

ہیلو، کیا کوئی صاحبِ دہاں ہیں جو میری بات کا جواب دیں۔ میں ایک امریکن یہودی ہوں، اور اسلام کے بارہ میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ میں نے امریکہ کی کئی مسجدوں میں ٹیلیفون کیا۔ مگر کیس سے مجھے اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ میں صرف اسلام کے بارہ میں معلومات چاہتا ہوں۔

یہ ایک ٹیلیفون کال تھی جو اسلامک سرکل آف نارٹھ امریکہ (ICNA) کے دفتر واقع جیکساں موصول ہوئی۔ ٹیلیفون پر موجود شخص نے اپنی استطاعت کے مطابق جواب دیا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس طرح کی کالیں اکثر امریکہ کی مسجدوں میں موصول ہوتی ہیں۔ مگر بروقت مسجد میں کسی موزوں شخص کی عدم موجودگی کی وجہ سے کال کرنے والے کو صحیح اور موثر جواب نہیں مل پاتا۔ یا سرے سے وہاں کوئی شخص موجود نہیں ہوتا جو ٹیلیفون کرنے والے کو ضروری اطلاع دے۔ آخر کار یہ واقعہ مذکورہ اسلامک سنٹر (آئنا) کے دفتر میں ہاٹ لائن ٹیلیفون نصب کرنے کا محرک بن گیا۔ ۱۹۹۵ میں یہ منصوبہ مکمل ہو جائے گا۔ اس کا نام دعوہ ہاٹ لائن ہوگا۔ اور اس کا نمبر اس طرح ہوگا: (1-800-662-ISLAM) اس لائن پر کوئی نہ کوئی تربیت یافتہ آدمی ہر وقت موجود رہے گا۔ اور پوچھنے والوں کو اسلام کے بارہ میں ضروری معلومات فراہم کرے گا۔ فی الحال اس مقصد کے لئے مذکورہ مرکز نے دو ہفتہ وار کونوں کی خدمات حاصل کی ہیں جو انگریزی زبان پر تدریس دے سکتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ انہوں نے اسلام کا اچھا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس منصوبہ کا ابتدائی خرچ ایک لاکھ ڈالر (۳۰ لاکھ روپیہ) ہے (دعوت، ۱۳ جولائی ۱۹۹۵)۔

قدیم زمانہ میں داعی کو مدعو کے پاس جانا پڑتا تھا۔ اب موجودہ زمانہ میں ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ مدعو خود داعی کے پاس پہنچ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ دنیا بھر کے شہری مراکز میں ایسے انتظامات کئے جائیں جہاں سے لوگ ٹیلیفون پر اسلام کے بارہ میں معلومات حاصل کر سکیں۔ ہندستان کے بڑے شہروں میں بھی اس کی سخت ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو غیر مسلموں کے اصلی طبقہ میں اسلام کا پیغام پہنچنے لگے۔

## اشاعت اسلام

ہندو دھرم میں یہ مانا گیا ہے کہ سچائی ایک ہے، مگر اس کے راستے جدا جدا ہیں۔ وہ مختلف مذاہب کو سچائی کے مختلف راستے تصور کرتا ہے۔ چنانچہ ہندو دھرم ہر مذہب کے احترام کی اپیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے ہزار سال سے ہندستان میں مذہب بدلنے کا عمل جاری ہے۔ مگر ہندو دھرم پر عقیدہ رکھنے والوں نے کبھی اس کو برا نہیں مانا، کیوں کہ ان کے عقیدہ کے مطابق یہ سچائی کی طرف جانے والے ایک راستہ کے بجائے دوسرے راستہ کے ذریعہ سچائی کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے کے ہم معنی تھا۔ پنڈت جو اہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکس آف انڈیا میں لکھا ہے کہ ہندستان میں مذہب کی تبدیلی پر اگر کوئی اعتراض کرتا ہے تو وہ سیاسی سبب سے ہوتا ہے مذکر مذہب ہی سبب سے۔

ہندو سنسکرتی کی یہ روایت ۱۹۳۷ء کے بعد ملک کے کانٹسٹی ٹیوشن (دستور) میں بھی باقاعدہ طور پر شامل کر دی گئی۔ چنانچہ دستور کی دفعہ ۲۵ میں ملک کے ہر شہری کا یہ ناقابل تنسیخ بنیادی حق قرار دیا گیا ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے مانے، جس مذہب پر چاہے عمل کرے اور جس مذہب کی چاہے تبلیغ کرے۔

اسی آزاد اذ فضا کا یہ نتیجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی ہندستان میں کثرت سے لوگ اسلام قبول کرتے رہے اور آج بھی ہر روز ملک کے مختلف علاقوں میں لوگ اپنی ضمیر کی آواز کے تحت مسلسل اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمز آف انڈیا کے شمارہ ۲۵ جون ۱۹۹۵ء میں صفحہ ۱۳ پر نام کی تبدیلی (Change of Name) کے زیر عنوان یہ اعلان شائع ہوا ہے:

I, Arvind Kumar, son of Shri Prem Kumar, r/o 67/6, Zamrud Pur, Greater Kailash Part-I, New Delhi 110048, by faith Hindu, would hereafter be called as Ateeq and has embraced Islam. (The Times of India, New Delhi, June 25, 1995)

میں اروند کمار ولد شری پریم کمار ساکن زمر دپور، گریٹر کیلاش، نئی دہلی، ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والا، اب حقیق کے نام سے پکارا جائے گا۔ اور میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

اس طرح کے اعلانات اخباروں میں برابر آتے رہتے ہیں۔ مثلاً ٹائمز آف انڈیا کے شمارہ ۲۲ مارچ ۱۹۹۶ میں شائع شدہ ایک اعلان کے مطابق، مسٹر اگھیشور کمار ولد مندریا کاسنگھ ساکن ۴، ۵۵۷ نیو چندر اول، ککلا نگر، نئی دہلی نے بتایا کہ انھوں نے اپنا نام بدل لیا ہے۔ اور اب ان کا نیا نام عمران صدیق ہے۔

اسی طرح ٹائمز آف انڈیا کے شمارہ ۲۷ مارچ ۱۹۹۶ میں شائع شدہ ایک اعلان کے مطابق، مسٹر شیام لال ولد سرجی رام، موضع شاہ پور، ڈاک خانہ ہر سولی، ضلع الور (راجستھان) نے اپنا نام اور مذہب تبدیل کر لیا ہے۔ ان کا نیا نام محمد سلیم ہے اور اب ان کا مذہب اسلام ہے۔

اسی شمارہ (ٹائمز آف انڈیا ۲۷ مارچ ۱۹۹۶) میں چھپنے والے ایک اور اعلان کے مطابق، مسز شاردابت مسٹر میش، موضع مجری، ڈاک خانہ بہرور، ضلع الور نے اپنا نام سارہ بیگم رکھ لیا ہے اور ہندو دھرم کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔

اس طرح کے واقعات ہندستان کے مختلف حصوں میں مسلسل ہو رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ اخبار میں آتے ہیں، اور بیشتر اخبارات میں نہیں آتے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندستان میں مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔ یہاں کے ہر شہری کو حق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس مذہب کو چاہے چھوڑے اور جس مذہب کو چاہے اختیار کرے۔

## حقیقت کی تلاش

لیوس کیرول (Lewis Carrol) ایک برٹش مصنف ہے۔ وہ ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۸ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے بچوں کے لئے کچھ کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ آئین دلچسپ ہیں کہ اس کی کہانیوں کی ایک کتاب کو پڑھ کر چھ سال کے ایک بچہ نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ اس کی ۶۰ ہزار جلدیں ہوں :

he wished there were 60,000 volumes of it. (3/967)

تاہم لیوس کیرول ایک غلگین آدمی تھا۔ اس نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ تنہائی میں زندگی گزار کر مر گیا۔ اس نے کہا کہ میں اس دنیا میں کیا ہوں۔ اُف۔ یہ ایک عظیم معما ہے :

Who in the world am I? Ah, that's the great puzzle.

یہ اس دنیا میں ہر شخص کا مسئلہ ہے۔ کوئی زیادہ شدت کے ساتھ اس کو محسوس کرتا ہے اور کوئی کم شدت کے ساتھ۔ تاہم کوئی بھی آدمی اس سوال سے خالی نہیں۔

عام جانوروں کا بنیادی مسئلہ صرف دو ہے، غذا اور تحفظ۔ جانور کو اگر یہ دو چیزیں مل جائیں تو اس کے بعد وہ نہایت سکون کے ساتھ سو جائے گا۔ مگر انسان کے اندر اسی کے ساتھ ایک اور چیز کی شدید طلب پائی جاتی ہے۔ اور وہ ہے زندگی کی حقیقت۔

فلسفہ اور سائنس جیسے علوم اس سوال کا تشفی بخش جواب نہیں دیتے۔ کیوں کہ فلسفہ اور سائنس کا علم تو خود انسان نے بنایا ہے۔ یعنی وہی انسان جو حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہے وہی ان علوم کو مرتب کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام علوم ناقص ہیں، اور ناقص علم سے کامل جواب حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

پیغمبرانہ الہام اسی سوال کا جواب ہے۔ جو آدمی اس کا مطالعہ کرے گا وہ اس میں اپنی طلب کا جواب پالے گا۔ پیغمبرانہ الہام خود اپنی ذات میں صداقت ہے۔ طالب کی بے آمیز فطرت کے سامنے جب یہ ربانی کلام آتا ہے تو خود اس کا اندرونی احساس یہ گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ عین وہی چیز ہے جو اس کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔ پیغمبرانہ الہامی کلام طالب کے لئے اپنی دلیل آپ بن جاتا ہے۔

## دعوتی امکان

فرانس کے ڈاکٹر جرینیہ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوه میں ان کے بارہ میں حسب ذیل رپورٹ شائع ہوئی ہے :

اسنی تتبعت كل الآيات القرآنية التي لها ارتباط بالعلوم الطبية والصحية والطبيعية التي درستها من مغربي واعرفها جيداً فوجدت هذه الآيات منطبقة كل الانطباق على معارفي الحديثة.. لقد اسلمت لانني تيقنت ان محمداً صلى الله عليه وسلم اتى بالحق الصريح من قبل الفسنة دون معلم او مدرس من البشر ولو ان كل صاحب فن من الفنون او علم من العلوم قادن كل الآيات القرآنية المرتبطة بما يعلم كما فعلت انا لاسلم بلاشك ان كان عاقلاً خالياً من الاعراض - الدعوه، الرياض 9 دسمبر 85ء بشرطيكه وه اغراض من خالي هو كراسه ديكهين۔

قرآن کو جب ایک شخص کھلے ذہن کے ساتھ پڑھتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ ایک ایسے مصنف کی کتاب ہے جو "ساتویں صدی" میں بھی "بیسویں صدی" کی باتوں کو جانتا تھا۔ قرآن کا یہ امتیاز واضح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدائے عالم الغیب کی کتاب ہے۔ یہ کسی انسان کی بنائی ہوئی کتاب نہیں۔ قرآن کی یہ استثنائی صفت قرآن کا زندہ معجزہ ہے۔ قرآن کی دعوت کو اگر آج کے انسان کے سامنے پیش کیا جائے تو قرآن کی یہ صفت اس کے حق میں بہت بڑی معجزاتی تائید ثابت ہوگی۔ لوگ مجبور ہوں گے کہ اس کو مانیں اور اس پر ایمان لائیں۔

## فکری طاقت

قرآن میں آئندہ آنے والے زمانہ کے بارہ میں جو خبریں دی گئی ہیں ان میں سے ایک پیش گوئی ہے جو سورہ نمبر ۴۱ میں ان الفاظ میں آئی ہے :

سنزیهم ایامنا فی الافاق و فی انفسهم حتی  
یتبین لهم انه الحق۔ اولم یکف بربک  
عقرب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے،  
آفاق میں اور انفس میں، یہاں تک کہ ان پر کھل  
جائے کہ یہ حق ہے۔ کیا یہ تیرے رب کے لیے کافی  
نہیں کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔  
(حم السجدة ۵۳)

اس آیت کے مطابق، نزول قرآن کے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ فطرت کی نشانیوں کا ظہور ہی تبیین حق کے لیے کافی ہو جائے۔ جب کہ کائنات اور انسان کے بارہ میں علمی انکشافات ہی ان حقائق کو ثابت شدہ بنا دیں جن کی خبر قرآن اور صاحب قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ اہل عالم کو دی گئی ہے۔

یہی بات حدیث میں ایک اور انداز سے آئی ہے۔ یہاں ہم اس سلسلہ میں صحیح مسلم کی ایک روایت نقل کرتے ہیں :

عن ابی ہریرۃؓ، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: "هل سمعتم بحدیثہ، جانب منها فی البر، وجانب منها فی البحر۔" قالوا: نعم یا رسول اللہ! قال: "لا تقوم الساعة حتی یفزعوا سبعون النبی من بنی اسحاق، فاذا جاؤا وهازلوا، فلم یقاتلوا بسلاح ولم یرموا بسهم، قالوا: لا الہ الا اللہ واللہ اکبر، فیقسط احد جانبیہا۔ قال ثوبان زید الراوی: لا اعلمہ الا قال: "الذی فی البحر، ثم یقولون الثانیة: لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر، فیقسط جانبہا الآخر، ثم یقولون الثالثة، لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر، فیفرج لهم فیذخون فیغنون، فینہام یقتمون المغانم اذا جاء، ہم الصریخ، فقال: ان الدجال قد خرج، فیترون کل شیء ویرجعون۔" رواہ مسلم۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم نے ایک شہر کے بارہ میں سنا ہے

جس کا ایک رُخ خشکی کی طرف ہے اور اس کا دوسرا رخ سمندر کی طرف ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک بنو اسحاق کے ستر ہزار افراد اس سے جنگ نہ کریں۔ جب وہ لوگ اس شہر تک آئیں گے تو وہاں اتریں گے۔ وہ کسی ہتھیار سے نہ لڑیں گے اور نہ کوئی تیر ماریں گے۔ وہ کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ پس اس کے دو رخوں میں سے ایک رُخ گر جائے گا۔ ثور بن زید (راوی حدیث) نے کہا کہ میں اس کے سوا نہیں جانتا کہ آپ نے فرمایا کہ وہ جو سمندر کی جانب ہے۔ پھر وہ لوگ دوبارہ کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ پس اس کا دوسرا رُخ گر جائے گا۔ پھر وہ لوگ تیسری بار کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ پس وہ ان کے لیے کھل جائے گا وہ اس میں داخل ہو جائیں گے اور غنیمت حاصل کریں گے۔ پس جب وہ غنیمت تقسیم کر رہے ہوں گے، اسی اثناء میں پکار سنائی دے گی۔ کہنے والا کہے گا کہ دجال نکل آیا۔ پس وہ ہر چیز چھوڑ دیں گے اور لوٹ آئیں گے۔

اس روایت کی ذیلی تفصیلات سے ہٹ کر اس کے اصل مدعا کو دیکھتے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آئندہ ایسا زمانہ آئے گا جب لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر کہہ دینے سے فتح حاصل ہوگی۔ بالفاظ دیگر، ہتھیار کو استعمال کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ بلکہ اسلام کی فکری اور نظریاتی طاقت ہی قوموں کو مستحکم کرنے کے لیے کافی ہو جائے گی۔

مذکورہ حدیث میں آخری زمانہ کے ایک واقعہ کا ذکر ہے جس کے لیے حدیث میں "عزودہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عزودہ کی تشریح فرمائی تو کہا کہ وہ نہ کسی ہتھیار سے لڑیں گے اور نہ کوئی تیر چلائیں گے۔ وہ صرف لا الہ الا اللہ کہیں گے اور ان کے لیے فتح کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ "عزودہ" کا مطلب لازمی طور پر جنگ و قتال نہیں ہے۔ فکری اور نظریاتی مہم بھی اسلام کے نزدیک عزودہ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق، دور آخر میں عزودہ کی یہی قسم مسلمانوں کے لیے غلبہ اور کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگی۔

## دعوت کی کرامت

غزوہ خندق ۶ ہجری میں پیش آیا۔ ابوسفیان کی سرداری میں دس ہزار مسلح آدمیوں نے مدینہ کو گھیر لیا۔ یہ بڑا سخت موقع تھا۔ اسی کے لئے قرآن میں آیا ہے کہ جب آنکھیں پھر گئیں اور دل گلوں تک پہنچ گئے (الاحزاب ۱۰) مدینہ میں گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ ایک مسلمان کی زبان سے بے اختیار اس قسم کے الفاظ نکل گئے :

کان محمد یعدنا ان ناکل بنور کسری و قیصر محمد ہم سے وعدہ کرتے تھے۔ ہم کسری اور قیصر کے واحدنا الیوم لایأمن علی نفسہ ان یدھب خزانے حاصل کریں گے اور حال یہ ہے کہ ہم میں الی الغناط لرسیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الثالث، صفحہ ۲۳۸) نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ اور امن ہر حال میں دشمن کی سرگرمیوں کی خبر معلوم کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب عظیم فرج مکہ سے روانہ ہوئے تو مدینہ میں آپ کو اس کی خبر ہوگئی۔ آپ نے لوگوں کو مشورہ کے لئے جمع کیا۔ اور ان سے پوچھا کہ بتاؤ ایسی حالت میں اپنے بچاؤ کے لئے کیا کیا جائے۔

اس وقت حضرت سلمان فارسی نے مشورہ دیا کہ مدینہ کے کنارے خندق کھودی جائے۔ مدینہ کے ایک طرف کھجوروں کے گھنے باغات نے قدرتی دیوار قائم کر رکھی تھی۔ شمال مشرق سے شمال مغرب تک کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ اسی حصہ میں خندق کھودی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ خندق کی لمبائی تقریباً پانچ ہزار باقاعدہ تھی۔ گہرائی سات باغ سے دس باغ تک اور چوڑائی تقریباً دس باغ۔

ابن کثیر نے طبری اور سیبلی کے حوازی سے لکھا ہے کہ پہلا شخص جس نے خندق کھودی وہ فارسیوں کا بادشاہ منوچہر بن فریدون تھا۔ وہ حضرت موسیٰ کا ہم عص تھا۔ حضرت سلمان فارسی کے رہنے والے تھے مشورہ کے وقت انھوں نے بتایا کہ اے خدا کے رسول، اہل ایران کا یہ طریقہ ہے کہ جب گھوڑے سوار شکر کے حملہ کا ڈر ہوتا ہے تو وہ اس کے مقابلہ کے لئے خندق کھودتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور خود صحابہ کے ساتھ شریک ہو کر خندق کھودی۔

”خندق“ کا لفظ اصلاً فارسی سے آیا ہے۔ اس کی اصل کندنہ (کھودنا ہوا) ہے۔ کندنہ سے کندنک اور خندق بنا جو عربی زبان میں خندق ہو گیا۔ اس وقت تک اہل عرب میں یہ طریقہ بالکل غیر معروف تھا۔ چنانچہ

مکہ والوں کے سرداروں نے جب اس کو دیکھا تو کہا:

والله ان هذه لسكينة ما كانت العرب تكتديها خدا کی قسم یہ ایک ایسی تدبیر ہے جس تدبیر کو عرب سیرۃ ابن ہشام، الجزء الثالث، صفحہ ۲۴۰) استعمال نہیں کرتے تھے۔

اس واقعہ میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب بھی عرب تھے اور وہ لوگ بھی عرب تھے جنہوں نے مکہ سے آکر آپ کے ادب چڑھائی کی تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کو ایسا شخص مل گیا جو ان کو فارسی خندق کا طریقہ بتائے۔ اور مکہ کے مشرکین کو فارسی خندق کا طریقہ بتانے والا نہیں ملا۔

اس فرق کی وجہ دعوتِ نبوی۔ مشرکین مکہ کا معاشرہ ایک جاہد معاشرہ تھا۔ اس میں باہر سے کوئی اضافہ ممکن نہ تھا۔ جب کہ مسلمانوں کا معاشرہ ایک اضافہ پذیر معاشرہ تھا جس میں ہر آن تیلخ کے ذریعہ مزید انسانی صلاحیتیں شامل ہوتی جا رہی تھیں۔ اسلام کا یہی خاص ایڈوانٹج تھا جس کی بنیاد پر اس کو ایک مسلمان فارسی مل گیا جو اس کو فارسی طریقہ بتائے۔ اس کے برعکس مشرکین مکہ کسی مسلمان فارسی کو نہ پاسکے جو ان کو عرب سے باہر کے طریقوں کی خبر دے۔

تاریخ کی کتابوں میں یہ دونوں واقعات الگ الگ لکھے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کا خندق سے باخبر ہو کر مدینہ کے گرد خندق کھودنا اور مشرکین مکہ کا خندق کی تدبیر سے بے خبر رہنا۔ ان دونوں واقعات کو الگ الگ پڑھتے تو آپ کو ان سے کوئی نصیحت نہیں ملے گی۔ مگر جب ان دونوں واقعات کو مربوط کریں، جب ان کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھیں تو اچانک ایک عظیم سبق کا انکشاف ہوتا ہے۔ یہ کہ دعوتِ اس دنیا میں سب سے بڑی قوت ہے۔ وہ اپنی قوت پر دوسروں کی قوت کا اضافہ ہے۔

دعوت کے بغیر معاشرہ ایک جاہد چٹان ہے۔ مگر دعوت کے اضافہ کے بعد معاشرہ ایک سیلاب بن جاتا ہے۔ ایسا سیلاب جو بڑھتا ہی رہے۔ ایسا سیلاب جو سارے جغرافیہ ارضی میں پھیل جائے۔ اسلام کی تاریخ اس نظریہ کی واقعاتی تصدیق ہے۔ مسلمان جب تک دنیا میں داعیِ گروہ کی حیثیت سے رہے، وہ ساری دنیا میں پھیلتے رہے۔ اسلام قطرہ سے سمندر بنتا رہا۔ مگر جب مسلمانوں نے داعیِ گروہ کی حیثیت کھودی تو ان کا معاشرہ بھی جاہد معاشرہ بن کر رہ گیا۔

## تاریخ کی زبان سے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: تم منکروں کی بات نہ مانو اور ان کے ساتھ جہاد کرو، بڑا جہاد (خلا تعلق

الکافرین و جہاد ہم بہ جہاد اکبیرا، فرقان ۵۲)

یہ سورہ العنکبوت کی آیت ہے۔ سورہ الفرقان بالاتفاق کی سورہ ہے۔ کی دور میں قتال کا حکم نہیں اترتا تھا بلکہ صراحتاً اس سے روکا گیا تھا (کفوا یدیکم و اقیوا الصلاۃ، نساء ۷۷) اس لئے یہاں جہاد کو لازماً غیر حربی مفہوم میں لینا ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے بہ کی ضمیر کا مرجع قرآن لیا ہے اور جہاد ہم بہ کی تفسیر جہاد ہم بالقرآن سے کی ہے (تفسیر ابن کثیر) اس تفسیر کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی دعوت پیش کرنے میں پوری کوشش کرو۔ قرآن کی نظریاتی اشاعت کے ذریعہ باطل کا مقابلہ کرو۔

جہاد کا لفظ قرآن کے دوسرے مقامات پر جنگ و قتال کے لئے بھی آیا ہے۔ مگر ایسے مقامات پر صرف جہاد کا لفظ ہے۔ مگر سورہ فرقان میں جس عمل کا ذکر ہے اس کو ”جہاد کبیر“ سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کی نظر میں سب سے بڑا جہاد وہ نہیں ہے جو میدان جنگ میں ہتھیاروں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ سب سے بڑا جہاد وہ ہے جو قرآنی پیغام کی تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے۔

اسلام کا اصل مقصد لوگوں سے لڑنا نہیں بلکہ لوگوں کو خدا کی رحمت کے سایہ میں لانا ہے۔ لڑائی اسلام کا ایک اتفاقی عمل ہے جب کہ دعوت اسلام کا اصلی اور دائمی عمل۔ مومن دوسروں کے حق میں حد درجہ خیر خواہ ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدا کے بندوں کو جہنم کے خطرے سے بچائے اور ان کو جنت کے راستہ پر لگائے۔ یہ کام سجدہ تبلیغ اور حکیمانہ نصیحت کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ لڑائی بھڑائی کے ذریعہ۔ نیز خارجی دنیا میں فتح کی اصل جڑ بھی دلوں کی فتح ہے۔ لوگوں کے دلوں پر قبضہ حاصل ہو جائے تو گویا ان کی ساری چیز قبضہ میں آگئی۔ تلوار کے ذریعہ حاصل کی ہوئی فتح عارضی اور جزئی ہوتی ہے اور دل کی راہ سے حاصل کی ہوئی فتح مستقل اور مکمل ہوتی ہے۔ اگر آپ نے جنگ کا میدان جیسا تو آپ نے صرف ایک ”میدان“ جیتا۔ لیکن اگر آپ نے دلوں کو جیت لیا تو آپ نے پوری قوم اور اس کے سارے اثاثہ کو جیت لیا۔

جو چیز حکمت سے حاصل ہو سکتی ہے اس کو جبر سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا صرف یہ خطرہ مول لینا ہے کہ وہ کبھی حاصل نہ ہو۔ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں حساب کتاب کا نظام قائم ہوا تو دفاتر کے لئے دبی یعنی زبانیں اختیار کر لی گئیں جو پہلے سے مخطوطہ ممالک میں رائج تھیں۔ مثلاً ایران کے لئے فارسی، شام کے لئے سریانی، مصر کے لئے قبطی۔ اگر اول دن سے عربی زبان پر اصرار کیا جاتا تو غیر ضروری قسم کے لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے جو کبھی ختم نہ ہوتے۔ مگر مقامی زبانیں اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام اور عربیت کی اشاعت

کا پر امن عمل اپنی فطری رفتار سے جاری رہا۔ یہاں تک کہ بالآخر یہ تمام علاقے عرب علاقے بن گئے اور سب کی زبان عربی زبان ہو گئی۔

اسلام کی اصل طاقت تلوار نہیں، اسلام کی اصل طاقت تبلیغ ہے۔ اس سلسلے میں یہاں ماسٹر تارا سنگھ (۱۹۶۷ - ۱۸۸۵) کا ایک بیان نقل کیا جاتا ہے:

جب کوئی مجھ سے یہ کہتا ہے کہ حضرت محمد صاحب نے تلوار کے زور سے اپنا مذہب پھیلایا تھا تو مجھے اس شخص کی نا سمجھی پر ہنسی آتی ہے۔ اس اعتراض کرنے والے کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس اعتراض سے تو وہ محمد صاحب کو ظہنی طاقت کا مالک تسلیم کر رہا ہے۔ اگر ایک تنہا محمد دینا کے مقابلہ میں تلوار سے کامیاب ہوتا ہے تو یقیناً یہ ایک معجزہ ہے۔ اپنی سچائی اور ایمان داری کی مدد سے کامیابی حاصل کرنا آنا بڑا معجزہ نہیں جتنا کہ تلوار کے زور سے مذہب پھیلانے میں کامیابی حاصل کرنا۔

فرض کیا جائے کہ محمد نے پہلا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا مسلمان تلوار کے زور سے ہی بتایا تھا تو یہ اشخاص جبراً مسلمان کئے جانے کی وجہ سے محمد کے دشمن ہو گئے ہوں گے۔ ایک ایک کو تو تلوار کے زور سے محمد صاحب مسلمان کر سکتے تھے۔ لیکن جب وہ تین چار اکٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے کیوں محمد صاحب سے بدلہ لیا۔ اگر اس بات کا جواب یہ دیا جائے کہ وہ مسلمان تو تلوار کے زور سے ہی ہوئے تھے لیکن بعد میں وہ محمد صاحب پر صدق دل سے ایمان لے آئے تھے، تو یہ ایک فضول س بات ہے جسے کوئی ماننے کو تیار نہ ہوگا کہ جس پر جبر کیا جائے وہی بسد میں دوست بن جائے۔ ایسی بھدی دلیل کے یہ معنی ہیں کہ کوئی ایک شخص جو جسمانی طور پر دوسروں سے طاقت ور ہے ایک ایک کو فتح کرنے کے بعد اپنا مذہب پھیلا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی مہل دلیل ہے کہ اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں نے بعض موقعوں پر مذہب کی مدد کے لئے تلوار کا استعمال ضرور کیا تھا۔ لیکن اس بات کی ذمہ داری حضرت محمد صاحب پر نہیں آسکتی۔ جو شخص مذہب کے نام پر تلوار کی جنگ میں شریک ہوتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالتا ہے اس کا ایمان بھی کافی حد تک مضبوط ہونا ہے۔ یقین کی پختگی کے بغیر کوئی شخص اپنے آپ کو جنگ کے خطرہ میں نہیں ڈالے گا۔ اس لئے تلوار چلانے کے لئے بھی تو پہلے یقین کرنے والے مضبوط دلوں کی ضرورت ہے جو صرف وعظ سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ تلوار بھی وعظ سے پیدا ہوئے یقین کے بغیر نہیں اٹھائی جا سکتی (رسول نمبر رسالہ مولوی دہلی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مصر ایک غیر مسلم ملک تھا۔ وہاں عیسائی اور مشرک تو ہیں ہی تھے۔ وہاں کی زبان قبضی تھی۔ اس کے بعد مصر کو مسلمانوں نے فتح کیا۔ مصر صرف سیاسی اعتبار سے فتح ہوا بلکہ سارا مصر

مسلمان ہو گیا۔ وہاں کی زبان بدل کر عربی زبان ہو گئی۔ ایسا کیوں کر ہوا۔ عام آدمی جس نے تاریخ کا گہرا مطالعہ نہ کیا ہو وہ کہہ دے گا کہ یہ تلوار کے ذریعہ ہوا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ مصر کو اور مصریوں کو جس نے فتح کیا وہ عربی تلوار نہیں تھی بلکہ عربی قرآن تھا۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کو غیر مسلم حقیقین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ سر آر تھر کیتھ ایک مشہور انگریز مورخ ہے۔ اس نے مصر کی قدیم تاریخ کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس نے مصر میں اسلام کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مصریوں کو جس چیز نے فتح کیا وہ تلوار نہیں تھی بلکہ قرآن تھا:

The Egyptians were conquered not by the sword, but by the Koran (303)

پروفیسر آرنلڈ کی کتاب دی پریچنگ آف اسلام (۱۸۹۹) خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ انھوں نے اسلام کی دعوتی تاریخ پیش کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ کس طرح اسلام اپنے نظریات کے زور سے پھیلتا رہا۔ یہاں اس کتاب کے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں:

”سینمبر مجھ کے پیر و پیغمبر کی موت کے صرف ایک سو سال میں رومن ایمپائر سے بھی زیادہ بڑی سلطنت کے مالک بن چکے تھے۔ بعد کی صدیوں میں اگرچہ عظیم مسلم سلطنت کے ٹوٹے ہو گئے اور اسلام کی سیاسی طاقت کم زور پڑ گئی۔ تاہم اس کی روحانی فتوحات بغیر کسی وقفہ کے جاری رہیں:

Still its spiritual conquests went on uninterruptedly (2)

جب منگول قبائل نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کی عظمت کو خون کے دریا میں بہا دیا، جب ۱۲۳۶ء میں زرتیناٹر نے مسلمانوں کو قزلبغ و غوناٹ سے نکال دیا جو اسپین میں اسلام کا آخری مرکز تھا تو عین اسی وقت اسلام نے سماترا اور ملایا میں اپنے نئے زمین حاصل کر لی۔ اپنے سیاسی تنزل کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی نمایاں روحانی فتوحات حاصل کی ہیں:

In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant spiritual conquests

سلجوقی ترکوں نے گیارھویں صدی عیسوی میں اور منگولوں نے تیرھویں صدی عیسوی میں قومی پیمانہ پر اسلام قبول کر لیا۔ یہ دونوں کے دونوں اسلام کے فاتح تھے مگر فاتحین نے اپنے مفتوحوں کے دین کو قبول کر لیا:

in each case the conquerors have accepted the religion of the conquered  
بغیر کسی دنیوی اور مادی طاقت کے مسلمان مبلغین اپنے دین کو وسط افریقہ، چین اور ایسٹ انڈیز جزائر تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے:

Unaided by the temporal power, Muslim missionaries have carried their faith into Central Africa, China and the East Indies Islands (2)

## شاہ کلید

ایک عربی پرچہ میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا عنوان تھا: المفتاح العظیم (عظیم کنجی)، اس میں بتایا گیا تھا کہ دعوت اسلام کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ ماضی میں اسلام نے دعوت کے ذریعہ عالمی فتح حاصل کی تھی، آج بھی ہم دعوت کے ذریعہ دوبارہ اپنی مشکست کوفتح میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے اکثر لکھنے اور بولنے والے اسی طرح آج کل دعوت کی باتیں کر رہے ہیں۔ مگر میں اسی کے ساتھ یہ تمام لوگ مسلمانوں کے خلاف غیر مسلم اقوام کی سازشوں اور دشمنیوں کا بھی اعلان کرتے رہتے ہیں۔ ایک طرف وہ مسلمانوں سے کبر رہے ہیں کہ تم لوگ داعی بنو۔ اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں سے مزید شدت کے ساتھ یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ دنیا کی تو میں تمہارے لئے ظالم بھیڑیا بن گئی ہیں، اس لئے ان سے لڑ کر ان کا خاتمہ کرو۔

یہ دونوں باتیں ایک ساتھ کہی جاتی ہیں۔ مگر وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک اگر دعوت ہے تو دوسری عداوت۔ غور کیجئے کہ وہ لوگ کون ہیں جن کو ظالم اور سازشی بتایا جاتا ہے۔ یہ وہی غیر مسلم قومیں ہیں جن کے اوپر ہمیں دعوت کا کام کرنا ہے۔ وہ ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ گویا مسلمان داعی ہیں اور ان کی پڑوسی غیر مسلم قومیں مدعو۔ اب اگر داعی کے دل میں یہ بٹھایا جائے کہ مدعو تمہارے لئے ظالم بھیڑیا ہے تو کیا وہ کچھ داعیانہ جذبہ کے ساتھ اپنے مدعو کے اوپر دعوت کا عمل جاری کر سکتا ہے۔ کیا وہ انی لکم ناصح کی نفسیات کے ساتھ اس سے معاملہ کر سکتا ہے۔

دعوت سرتاسر محبت کا ایک عمل ہے۔ داعی کو آخر حد تک اپنے مدعو کی ہدایت کا حریص بننا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی دعوت کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ مدعو اگر زیادتی کرے تب بھی داعی اس کی زیادتیوں کو بھلا کر ایک طرہ طور پر اس کو اپنی دلچسپی کا موضوع بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے دل کو مدعو کی شکایات سے اتنا زیادہ خالی کرتا ہے کہ اس کے دل سے مدعو کے حق میں دعائیں نکلنے لگیں۔

لوگ دعوت کی باتیں کرتے ہیں مگر وہ اس کے آداب نہیں جانتے۔ لوگ داعی کا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں، بغیر اس کے کہ وہ اس کے تقاضے کو پورا کریں۔ لوگ شہادت علی الناس کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں، بغیر اس کے کہ انہوں نے اس کی قیمت ادا کی ہو۔

یہ صرف ان ملکوں کا معاملہ نہیں جہاں مسلمان کمزور اقلیت ہیں۔ ٹھیک ہی نفسیات ان ملکوں کے مسلمانوں کی بھی ہے جہاں انہیں اکثریت حاصل ہے یا جہاں بلواری کی پوری آبادی مسلمان ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اقلیتی علاقہ کے مسلمانوں کو مقامی غیر مسلم طاقت سے شکایت ہے۔ اور اکثریتی علاقہ کے مسلمانوں کو عالمی غیر مسلم طاقتوں سے۔ مثلاً یہودی، عیسائی، اشتراکی مستعمرین، مستشرقین وغیرہ۔

اسلام میں دعوت کی مصلحت ہر دوسری مصلحت پر مقدم ہے۔ دعوت کے مفاد کی خاطر ہر دوسری چیز کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ بذات خود کتنی ہی زیادہ سنگین اور کتنی زیادہ اہم کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اس معاملہ میں اتنی واضح رہنمائی کرتی ہے کہ طالب حق کے لئے ادنیٰ شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

ہجرت سے کچھ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف گئے۔ وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ حد درجہ توہین و تذلیل کا سلوک کیا جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ آپ نے خود حضرت عائشہ سے فرمایا کہ طائف کے دن سے زیادہ سخت دن میرے اوپر کوئی اور نہیں گذرا۔ روایات بتاتی ہیں کہ جب آپ غم اور تکلیف کے ساتھ طائف سے واپس ہوئے تو راستہ میں اللہ کے حکم سے ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) آپ کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اللہ نے آپ کی قوم کی باتیں نہیں۔ میں ملک الجبال ہوں۔ اگر آپ نہیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کے ذریعہ اس بستی کو کچل دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی انگلی نسلوں سے ایسا شخص پیدا کرے گا جو اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے (ارجو ان یخرج اللہ من اصلاہم من یعبد اللہ لا یشرک بہ شیئاً۔ اسیرۃ النبویہ لابن کثیر، المحدثانی، صفحہ ۵۳)۔ دعوت بلا شبہہ فضائل عظیم ہے، مگر اس مفسد عظیم کو استعمال کرنے کے لئے قلب عظیم و دیکار ہے۔ اس کے لئے وہ کردار مطلوب ہے جس کو قرآن میں بلند اخلاق، خلق عظیم، کہا گیا ہے۔ قلب عظیم کے بغیر بونی آدمی ذوق و توفیق کے امکانات کو جان سکتا ہے، ورنہ اس کے بغیر وہ اس قابل ہو سکتا کہ وہ ان امکانات کو استعمال کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کے لئے دعوت کو ابدی طور پر مفتح عظیم بنا دیا ہے۔ اسلامی تاریخ کے دورانوں میں مسلمانوں کو جو کچھ حاصل ہوا، دعوت کے ذریعہ حاصل ہوا۔ آج بھی انہیں جو پکڑے گا، دعوت کے ذریعہ ملے گا۔

مزید یہ کہ یہ مفتح عظیم موجودہ زمانہ میں مفتح اعظم بن چکی ہے۔ رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ عالمی تاریخ میں جو انقلاب آیا اور جس کے اثرات آج تک جاری ہیں، اس نے دعوت کے عمل کو ہمیشہ سے زیادہ آسان اور ہمیشہ سے زیادہ طاقت ور بنا دیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں صرف یہ نہیں ہوا ہے کہ جدید وسائل اعلام نے دعوت کی اشاعت و توسیع کے نئے دروازے کھول دئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ علوم کے ارتقاء اور سائنسی تحقیقات نے اسلام کی حقانیت کو مزید ثابت شدہ بنا دیا ہے۔ آج اسلام کی صداقت خالص عقلی سطح پر ایک مسلمہ صداقت بن چکی ہے۔ ہمارے اسلاف نے جو کام ”عمر کے حالات میں کیا، اب وقت آگیا ہے کہ اس کام کو ”یسر“ کے حالات میں انجام دیا جائے۔

دعوت اہل اسلام کے لئے شاہ کلید ہے، مگر وہ شاہ کلید اس وقت ہے جب کہ اس کو اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے۔

## حق کی طاقت

ابرہہ (Abrames) قدیم یمن (جنوبی عرب) کا حبشی عیسائی حکمران تھا۔ اس نے یمن کے دارالسلطنت صنعا میں ایک بہت بڑا ایسی کلیسا (Ekklesia) بنایا۔ چونکہ جزیرہ عرب کا سب سے زیادہ مقدس عبادت خانہ کعبہ کو سمجھا جاتا تھا اور زیادہ تر لوگ اسی کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے۔ ابرہہ نے چاہا کہ وہ کعبہ کو ڈھاوے تاکہ تمام لوگ اس کے بنائے ہوئے عبادت خانہ میں آئیں، اور اس طرح عرب کا مذہبی مرکز مکہ سے صنعا کی طرف منتقل ہو جائے۔

اس منصوبہ کے مطابق، ابرہہ ۶۰۰ء میں یمن سے مکہ کے لیے روانہ ہوا۔ اس کا لشکر ۶۰ ہزار مسلح آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس کے ساتھ ایک درجن ہاتھی تھے جو آگے آگے چل رہے تھے۔ اس واقعہ کی تفصیلات بہت لمبی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مکہ کے سردار عبدالمطلب کو جب معلوم ہوا کہ اس قسم کا بے پناہ لشکر کعبہ کو ڈھانے کے لیے مکہ کی طرف بڑھ رہا ہے تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ خود اس سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ انھوں نے بیت اللہ میں داخل ہو کر اللہ سے دعائیں کیں۔ اس سلسلہ میں ان کے بہت سے اشعار کتابوں میں آئے ہیں، ان کا ایک شعر یہ تھا:

يَارِئِبِ لَا اِرْجُوْهُمُ سِوَاكَ يَارِئِبِ فَاَمْنَعُ مِنْهُمْ جِمَاكَ

اے میرے رب۔ ان کے مقابلہ میں تیرے سوا میں کسی سے امید نہیں رکھتا، اے میرے رب، تو ان سے اپنے حرم کی حفاظت کر، اس طرح عبدالمطلب نے کعبہ کو اللہ کے حوالے کیا اور قہید کے دوسرے لوگوں کے ساتھ بستی سے نکل کر پہاڑوں میں چلے گئے اور وہاں چھپ کر بیٹھ گئے۔

ابرہہ اپنے لشکر کے ساتھ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ حدود حرم پر پہنچا تو اس کے ہاتھی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کو مار مار کر زخمی کر دیا گیا مگر وہ آگے نہ بڑھا۔ اسی دوران بے شمار چڑیلوں کے جھنڈ فضا میں ظاہر ہوئے۔ ان کے چونچ اور ان کے پنجوں میں کسنکریاں تھیں۔ انھوں نے یہ کسنکریاں ابرہہ کے لشکر پر گرائیں تو وہ گولیوں کی بارش کی مانند ان پر برسے لگیں۔ ابرہہ سمیت پورا لشکر بھس کی طرح چورا چورا ہو کر رہ گیا۔ یہ واقعہ مکہ کے قریب دادی محبت میں پیش آیا۔ اس واقعہ کے بعد عربوں نے قدیم رواج کے مطابق بہت سے اشعار کہے اور ان میں اپنے

جذبات اور شہادت کا اظہار کیا۔ ابوقیس بن الاسد کا ایک شعر یہ ہے :

فَلَمَّا أَتَاكُمْ نَصْرُ ذِي النُّعْرَيْنِ رَدَّهْمُ جُنُودُ الْمَلِيحِ بَيْنَ سَافٍ وَحَاصِبٍ

پھر جب تمہارے پاس عرش والے کی مدد آگئی تو اس بادشاہ کے لشکر (پرنڈول) نے ان کو مٹی اور اور پتھر سے مار کر پسا کر دیا (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول - صفحہ ۶۲)

ابربہ کا مذکورہ واقعہ ۶۵۰ء میں پیش آیا تھا۔ اس کے ٹھیک ۵۸ سال بعد ۶۹۸ء میں اسی مکہ کی سرحد پر ایک اور واقعہ اس سے مختلف صورت میں پیش آیا۔ یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ واقعہ ہے جو اسلامی تاریخ میں صبح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس وقت رسول اللہ علیہ وسلم اپنے دارِ ہجرت (مدینہ) میں تھے۔ ایک خواب کے مطابق آپ اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ عمرہ کے ارادہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تھے کہ مکہ کے قریش نے آگے بڑھ کر آپ کو روکا۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ عمرہ کے بغیر مدینہ واپس جائیں۔

قریش کا آپ کو عمرہ سے روکنا یقینی طور پر ظلم اور سرکشی کا واقعہ تھا۔ بظاہر دیکھئے تو یہاں قریش کہ بدل ہونی صورت میں وہی کردار ادا کر رہے تھے جو ۵۸ سال پہلے اربہ نے ادا کیا تھا۔ اب بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ جس طرح اربہ کے اوپر خدا نے آسمانی سزا بھیجی اسی طرح دوبارہ قریش کے اوپر آسمانی سزا آتی اور انہیں تباہ کر دیتی تاکہ وہ رسول اور اصحاب رسول کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ پھر اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس فرق کا کم از کم ایک سبب یہ ہے کہ اربہ کے حملہ کے وقت فریق ثانی کے پاس وہ نظریاتی ہتھیار موجود نہ تھا جو پیغمبر اسلام کے ساتھ حدیبیہ کے واقعہ کے وقت موجود تھا۔

اربہ کے حملہ کے وقت ابھی قرآن کا نزول نہیں ہوا تھا۔ مگر اس کے ۵۸ سال بعد جب حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا، اس وقت پیغمبر آسمان الزماں مبعوث ہو چکے تھے۔ اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنا سچا دین قرآن کی صورت میں بھیج دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ دین کی اور اہل دین کی حفاظت فرمائے گا۔ تاہم اربہ کے زمانہ

میں اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت کا انتظام اس طرح کیا کہ حق کے دشمنوں پر آسمان سے پتھر برسائے۔ مگر پیغمبرِ آخر الزماں کی بعثت کے بعد اب صورت حال بدل چکی تھی۔ اب اہل حق کے پاس دینِ فطرت کی صورت میں وہ طاقت و اختیار موجود ہے جس کے آگے کوئی مخالفانہ ہتھیار کارگر نہیں ہو سکتا۔ یہ دین لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر حملہ کرتا ہے۔ وہ دشمن کو دوست کے روپ میں بدل دیتا ہے۔ وہ انسان کو اندر سے مسخر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ دین بلاشبہ سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اور جب آدمی کے پاس بڑا ہتھیار ہو تو چھوٹا ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ میں قریش سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر کے لوٹے تو مسترآن میں یہ آیت اتری کہ خدا نے تم کو کھلی فتح دے دی اور تم کو نضرِ عزیز سے سرفراز فرمایا (الفتح) چنانچہ اس کے سرف و برس بد لوگوں نے دیکھا کہ جو لوگ اسلام کے دشمن بنے ہوئے تھے، وہ اسلام کے دوست اور اس کے دست و بازو بن گئے ہیں۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے خلاف جو لوگ سرکشی کر رہے تھے، ان کے بارہ میں قرآن میں کہا گیا — بلکہ ہم حق کو باطل پر ماریں گے تو وہ اس کا سر توڑ دے گا اور دفتہ وہ جاتا رہے گا (الانبیاء، ۱۸) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ عبدالمطلب کے زمانہ میں ابراہیم کے لشکر کو پتھروں سے مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سرکشی کرنے والوں کو خود حق کی مہرب سے مفتوح اور مغلوب کر دیا گیا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ فکری اور نظریاتی شکست، فوجی شکست سے کہیں زیادہ سخت ہے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ایک باری نبوت ہے۔ وہ قیامت تک باقی رہے گی۔ اس دوسرے دور میں حق کے مخالفین کو زیر کرنے کے لیے انھیں گنہگار پتھر مارنے کی ضرورت نہیں۔ اہل حق کو چاہیے کہ وہ حق لے کر اٹھیں جس طرح پیغمبرِ اسلام حق لے کر اٹھے۔ اور پھر تمام مخالفین حق ان کے سامنے سے بھاگتے ہوئے نظر آئیں گے: جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَّقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (حق آیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل تھا ہی ٹٹنے والا)



## فطرت کی آواز

محمد اسرائیل صاحب بی ایس سی (۲۴ سال) الور کے رہنے والے ہیں۔ ان سے ۴ جنوری ۱۹۹۲ کو دہلی میں ملاقات ہوئی۔ وہ الرسالہ کے قاری ہیں اور دوسروں کو بھی الرسالہ پڑھاتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کئی سبق آموز واقعات بتائے۔

انھوں نے کہا کہ الور کے گورنمنٹ کالج میں ۱۹۹۰ میں وہ اور مسٹر مدن لال قریب قریب رہتے تھے۔ مسٹر مدن لال وہاں ایم اے ہسٹری کے طالب علم تھے۔ اسرائیل صاحب نے ان کو الرسالہ انگریزی کا ایک شمارہ پڑھنے کے لیے دیا۔ چند دن کے بعد انھوں نے کہا کہ میں نے اس میگزین کو پڑھا۔ تاثر پوچھے پر انھوں نے کہا: اس کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی رائٹر نہیں بول رہا ہے بلکہ انسان کا نیچر بول رہا ہے۔

یہ بلاشبہ صحیح ترین تبصرہ ہے۔ الرسالہ میں اسلام کا پیغام ہوتا ہے۔ اور اسلام کی بات جب بے آمیز صورت میں پیش کر دی جائے تو وہ عین انسانی نیچر کی بات بن جاتی ہے۔ کیوں کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اسلام فطرت انسانی کا منہ ہے۔ اسلام انسان کا خود اپنا مطلوب ہے۔

قدیم زمانہ میں مذہبی تعصب بہت زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ یہی مذہبی تعصب پیغمبروں کی بات کو سمجھنے اور ماننے میں رکاوٹ بنتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں جدید افکار اور جدید تعلیم نے مذہبی تعصب کو ختم کر دیا ہے۔ اب انسانی فطرت سے وہ مصنوعی پردہ ہٹ گیا ہے جو قدیم زمانہ میں ہوا کرتا تھا۔ اس لیے اسلام اب انسان کے لیے عملاً اتنا ہی قابل قبول بن چکا ہے جتنا پانی کسی پیاسے آدمی کے لیے۔

اب اہل اسلام کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ ایسی ہر کارروائی سے بچیں جو ان کے اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کی فضا پیدا کرنے والی ہو۔ اور پھر اسلام کو اس کی سادہ صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔ اس کے بعد غیر مسلم قومیں اسلام کو خود اپنے دل کی آواز سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑیں گی۔

اسلام کی نفی کرنا خود اپنی نفی کرتا ہے۔ اور کون ہے جو خود اپنی نفی کرنے کی قیمت پر کسی چیز کا انکار کرے۔

## ایک امکان

اخرج ابو نعیم عن محمود بن لبید اخي بنی عبد الاشهل قال : لما قدم ابو الحیسم النبی بن رافع مکةً ومعه فتية من بنی عبد الاشهل فیهما ایاس بن معاذ رضی اللہ عنہ یلقون الجلف من قریش علی قیومہم من الخزرج . فمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہم فاتاہم فجلس الیہم فقال : هل لکم الی خیر مما جئتم لہ فقالوا وما ذاک قال ان رسول اللہ بعثنی اللہ الی العباد ادعوہم الی اللہ ان یعبدا اللہ ولا یشرکوا بہ شیئاً وانزل علی الکتاب ثم ذکر الاسلام وتلا علیہم القرآن فقال ایاس بن معاذ وکان غلاماً حدثاً ای قوم . هذا واللہ خیر مما جئتم لہ

مدینہ کے مشرک سردار ابو الحیسم مدینہ سے مکہ آئے۔ ان کے ساتھ بنو عبد الاشہل کے کچھ جوان تھے۔ ان میں ایاس بن معاذ بھی شامل تھے (جو بعد کو مسلمان ہو گئے) وہ لوگ قبیلہ خزرج کے متبادل میں قریش کو اپنا حلیف بنانا چاہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آمد کی خبر سنی تو آپ ان کے یہاں گئے۔ آپ ان کے پاس بیٹھے اور فرمایا: تم لوگ جس مقصد کے لیے آئے ہو، کیا اس سے بہتر چیز کی تمہیں رغبت ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیا چیز ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے مجھے بندوں کی طرف بھیجا ہے۔ میں ان کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں۔ اور خدا نے میرے اوپر کتاب اتاری ہے۔ پھر آپ نے اسلام کا تذکرہ کیا اور ان کو قرآن پڑھ کر سنایا۔ یہ سن کر ایاس بن معاذ نے کہا، وہ اس وقت ایک نوجوان تھے، کہ اے قوم، یہ خدا کی قسم اس سے بہتر ہے جس کے لیے تم یہاں آئے ہو۔

مکہ قدیم زمانہ میں عرب کا مرکز تھا۔ مختلف بیرونی مقامات سے لوگ مکہ آتے رہتے تھے۔ کوئی سیاسی مقصد سے آتا، کوئی تجارتی مقصد سے، کوئی مذہبی مقصد سے۔ سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ایسی کسی جماعت یا کسی شخص کی آمد کی اطلاع ملتی تو آپ چل کر اس کے

پاس جاتے اور اس کے سامنے اسلام پیش کرتے۔ پھر کوئی ماننا اور کوئی انکار کر دیتا۔ دیگر اصحاب بھی اسی اسوہ پر عمل کرتے۔

موجودہ زمانہ میں مجموعی اعتبار سے عرب ملکوں کی یہی صورت ہو رہی ہے۔ یہاں دنیا بھر سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ آ رہے ہیں۔ ان میں بہت بڑی تعداد غیر مسلموں کی ہوتی ہے۔ یہ لوگ معاش کے حصول کے لیے یا دوسرے مقاصد کے لیے عرب ملکوں میں آتے ہیں۔ اس طرح دوبارہ زیادہ بڑے پیمانہ پر وہی موقع پیدا ہو گیا ہے جو قدیم زمانہ میں رسول اور اصحاب رسول کو حاصل تھا۔

آج ضرورت ہے کہ عرب ممالک میں نہایت خاموشی اور نہایت منظم انداز میں اسی طرح لوگوں کے سامنے دین حق کی دعوت پیش کی جائے جس طرح دور اول میں پیش کی گئی تھی۔ انھیں بتایا جائے کہ تم لوگ یہاں پٹرو ڈالر کے لیے آئے ہو، مگر ہمارے پاس تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے۔ وہ اللہ کا سچا دین ہے جو آدمی کے لیے جنت میں داخلہ کی ضمانت ہے۔ پٹرو ڈالر تمہارے میاں زندگی کو کچھ بڑھا سکتا ہے، مگر خدا کا سچا دین اختیار کر کے تم اپنی ابدی زندگی کو لامحدود طور پر کامیاب کر سکتے ہو۔

اگر ایسا کیا جائے تو یقین ہے کہ ان میں "ایکس بن معاذ" کی طرح ایسے لوگ نکلیں گے جو کہہ پڑیں کہ اسی قوم۔ ہذا واللہ خیر مما جئتہم نہ (اے لوگو، یہ اس سے بہتر ہے جس کے ارادہ سے تم یہاں آئے ہو)، اس طرح یہ ہوگا کہ عرب دنیا جو آج لوگوں کے لیے صرف پٹرو ڈالر حاصل کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہے وہ اس سے زیادہ بڑی دولت، دین حق کی دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

اطلاعات بتاتی ہیں کہ اس وقت بھی عرب دنیا میں لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ بیرونی ملکوں کے جو لوگ عرب ممالک میں تلاش روزگار کے لیے جاتے ہیں وہ اپنی معاشی ضرورت کے تحت عربی زبان سیکھتے ہیں۔ وہ اسلامی تہذیب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ عربوں سے میل ملاپ کے دوران اسلام کے بارہ میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی ایک تعداد اسلام سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتی ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کسی دعوتی جہد و جہاد کے بغیر اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اب اگر باقاعدہ طور پر دعوت و تبلیغ کی جہد و جہاد شروع کی جائے اور اس کو حکیمانہ انداز میں چلایا جائے تو یہ رفتار یقینی طور پر بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

## علم کی کسوٹی پر

بائبل میں آدم کے بعد انسانی نسل کا پورا شجرہ نسب دیا گیا ہے۔ اس سے حساب لگا کر مسیحی علماء نے زمین پر آباد کاری کی مدت متعین کی ہے۔ یہ مدت ۱۹۷۵ میں ۵۷۶۶ سال تھی۔ دوسری طرف جدید علمی طریقوں سے زمین کی عمر اور اس پر آباد کاری کی مدت کا جو اندازہ کیا گیا ہے، اس کے مطابق یہ مدت مذکورہ اندازہ سے بہت زیادہ قرار پاتی ہے۔ اس اختلاف نے جدید علماء کی نظر میں بائبل کے بیان کو مضحکہ نیز بنا دیا۔

اسی طرح بائبل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ یعنی ۲۴ گھنٹہ والے چھ دنوں میں۔ یہاں بھی سائنس کی تحقیق بائبل کے بیان سے ٹکرا رہی تھی۔ کیوں کہ سائنسی مطالعہ کائنات کی تخلیق کو اربوں اور کھربوں سال کے درمیان پیش آنے والا ایک واقعہ بتا رہا تھا نہ کہ صرف ۲۴ گھنٹہ (چھ دن) کے اندر پیش آنے والا واقعہ۔ اس تضاد کی بنا پر جدید انسان کو بائبل علمی حیثیت سے ایک غیر معتبر کتاب نظر آنے لگی۔

علم اور مسیحیت کے درمیان اس طرح کے بہت سے ٹکراؤ پیش آئے۔ اس نے ابتداءً مسیحیت کو اور اس کے بعد تمام مذاہب کو جدید انسان کی نظر میں غیر حقیقی ثابت کر دیا۔ اس نے مذہب کو توہماتی قیاسات کا مجموعہ سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیا۔

اس ٹکراؤ نے ابتداءً تمام مذاہب کو جدید انسان کی نظر میں غیر معتبر بنا دیا۔ مگر موجودہ صدی کے نصف ثانی میں مزید تحقیق نے بتایا کہ یہ ٹکراؤ دراصل سائنس اور معرفت مذہب کے درمیان تھا نہ کہ سائنس اور حقیقی مذہب کے درمیان۔

اس جدید تحقیق نے ساری دنیا میں اسلام کی اشاعت کے نئے مواقع کھول دیے ہیں۔ ایک طرف دوسرے مذاہب ہیں جن کے منطوق واضح طور پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ علمی لحاظ سے قابل اعتبار نہیں ہیں۔ دوسری طرف اسلام کے بارہ میں یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ استثنائی طور پر دوسرے مذاہب سے الگ ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں کوئی بات بھی غیر علمی نہیں۔ وہ جس طرح سچا الہام ہے، اسی طرح وہ خالص علم کی جاچ میں بھی پورا اترتا ہے۔

## حق کی تلاش میں

مسٹر نٹور سنگھ چین اور پاکستان میں ہندستان کے سفیر رہ چکے ہیں۔ ان کے چینی دوستوں میں سے ایک خاتون بھی ہیں جن کا نام ہین سوئن (Han Suyin) ہے۔ مسٹر نٹور سنگھ نے اس چینی خاتون کا ذکر اپنی ایک کتاب میں کیا ہے جو ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی ہے :

K. Natwar Singh, *Curtain Raisers*  
Vikas Bhawan, New Delhi, 1983

اس کتاب کے ایک باب میں مذکورہ خاتون ہین سوئن کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے انگریزی میں مسٹر نٹور سنگھ کے نام لکھے تھے۔ ایک خط جس پر ۱۴ جون ۱۹۸۰ء کی تاریخ درج ہے، اس میں مسز ہین سوئن لکھتی ہیں کہ میری شدید خواہش ہے کہ آپ سے اسلام کے بارہ میں بہت لمبی گفتگو کروں :

I do intend to have a very long talk with you on Islam.

خط میں یا اصل کتاب میں اس کی مزید تفصیل درج نہیں۔ غالباً ہین سوئن کو کوئی مسلمان نہیں ملا جس سے بات کر کے وہ اسلام کے بارہ میں تفصیلی معلومات حاصل کریں۔ انہوں نے مسٹر نٹور سنگھ کو اس چیتیت سے دیکھا کہ وہ ہندستان کے باشندے ہیں، اور ہندستان وہ ملک ہے جہاں انڈونیشیا کے بعد دوسری سب سے بڑی مسلم آبادی ہے۔ نیز مسٹر نٹور سنگھ ایک مسلم ملک (پاکستان) میں سفیر رہ چکے ہیں۔ اس بنا پر مسز ہین سوئن نے سمجھا کہ وہ ان کو اسلام کے بارہ میں تفصیلی معلومات دے سکیں گے۔

اللہ کے کئے بندے اور بندیاں سچائی کی تلاش میں ہیں مگر کوئی ان کو سچائی کی بات بتانے والا نہیں۔ کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرے تو تمام مسلمان اس سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو جائیں گے۔ مگر کارِ نبوت سے عملاً وہ اس طرح غافل ہیں جیسے انھیں انتظار ہو کہ دوبارہ کوئی نبی آئے اور ان کی طرف سے یہ کام کر دے۔ یہ صورت حال اس وقت ہے جب کہ مسلمان ساری دنیا میں تقریباً ایک سو کروڑ ہیں۔ ہجوم کے درمیان سناٹا کی اس سے زیادہ عجیب مثال کوئی دوسری نہیں ملے گی۔

## ایک لطیف

شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲-۱۱۹۳) فارسی کے مشہور شاعر ہیں۔ ان کی کتابوں (گلستاں، بوستاں) کے ترجمے یورپ کی اکثر زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ایک مشرقی ڈاکٹر ہرڈر (J.G. Herder) نے سعدی کی کتاب گلستاں کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ سلطان کے باغ میں اگنے والا بہترین پھول ہے:

... the finest flower that could blossom in  
a Sultan's garden. (9/964)

شیخ سعدی کا ایک لطیف ہے۔ ایک بار وہ کاشغریں تھے جو اس وقت یعنی ترکستان کا صدر مقام تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ تاتاریوں اور خوارزمیوں میں جنگ کے بعد عارضی صلح ہو گئی تھی۔ شیخ سعدی نے ایک مسجد میں دیکھا کہ ایک طالب علم عربی قواعد کی کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے ہے اور ضرب زید عمرواً، ضرب زید عمرواً کا جملہ رٹ رہا ہے۔ انھوں نے طالب علم سے کہا کہ صاحبزادے، خوارزم اور خطا میں تو صلح ہو گئی، مگر زید عمرو کو لڑائی ابھی چسلی جا رہی ہے۔ طالب علم ہنس پڑا اور شیخ کا وطن پوچھا۔ شیخ کی زبان سے شیراز کا نام سنا تو فرمائش کی کہ سعدی کا کچھ کلام یاد ہو تو سناؤ۔ شیخ سعدی نے حسب موقع یہ شعر موزوں کر کے پڑھا:

اے دل عشاق بدام تو صید ما تو مشغول و تو با عمرو و زید

اے وہ کہ عاشقوں کے دل نیرے دام میں گرفتار ہیں، ہم تجھ میں مشغول ہیں اور تو عمرو اور زید میں مشغول ہے۔

یہ لطیف موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر بڑی طرح صادق آتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جنگ کا طریقہ فرسودہ ثابت ہو چکا ہے۔ تمام ترقی یافتہ قومیں اپنے نزاعات کو سخت و شدید کے ذریعے کر رہی ہیں۔ حتیٰ کہ روس اور امریکہ نے ایک دوسرے کے خلاف اپنے ہتھیاروں کو رکھ دیا ہے۔ مگر مسلمان ہر جگہ جہاد کے نام پر بے فائدہ لڑائی میں مشغول ہیں۔ موجودہ زمانہ کا انسان تمام چیزوں سے اکتا کر دین حق کی طرف آ رہا ہے۔ وہ اسلام کے سایہ رحمت میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ مگر مسلمان لڑائی بھگڑنے کے کاموں میں اتنا زیادہ مشغول ہیں کہ ان کو نہ جدید انسان کی اس طلب کی خبر ہے اور نہ اس کو استعمال کرنے کی فرصت۔

## نظریاتی خلا

۱۹۹۱ کے خاتمہ کے ساتھ سوویت یونین کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس سیاسی خاتمہ کے ساتھ اشتراکیت (کمیونزم) کا فکری سحر بھی ختم ہو گیا۔ فکری سحر کے خاتمہ کی مختلف علامتوں میں سے ایک عبرت انگیز علامت یہ ہے کہ ولادیمیر لینن کے دیو قامت مجسمے جو اس سے پہلے اشتراکی شہریوں کو اپنے چھوٹے ہونے کا احساس دلاتے تھے، اب وہ انہیں اشتراکی شہریوں کے ہاتھوں ذلت کے ساتھ گرائے جا رہے ہیں۔

۱۹۹۱ کے خاتمہ کے ہینوں میں ہر جگہ اسی کا چرچا تھا۔ اس زمانہ میں ہر اخبار اور ہر میگزین میں ایسے مضامین آرہے تھے جن کا عنوان ہوتا تھا — سوویت یونین کا انہدام (The collapse of Soviet Union)

اس کے بعد ہر طرف یہ کہا جانے لگا کہ اب دو قطبی دنیا (bi-polar world) کا دور ختم ہو گیا اور اب ایک قطبی دنیا (uni-polar world) کا دور شروع ہو چکا ہے۔ یہ باتیں ہورہی تھیں کہ ۹ جنوری ۱۹۹۲ کے اخبارات یہ خبر لائے کہ صدر امریکہ مسٹر جارج بش ٹوکیو میں ایک اسٹیٹ ڈنر پر تھے کہ وہ اپنی کرسی سے گر پڑے۔ ٹائمز آف انڈیا (۹ جنوری ۱۹۹۲) کی سرخی کے الفاظ یہ تھے :

Bush collapses at Tokyo reception.



روس میں کمیونزم کا خاتمہ، لینن کا مجسمہ زمین پر گرنا جو اسے

راقم الحروف کا خیال ہے کہ پہلا انہدام اگر حقیقی تھا تو دوسرا انہدام علامتی ہے۔ سوویت یونین عملاً منہدم ہو چکا۔ امریکہ بھی امکانی طور پر اپنے انہدام کے قریب ہے۔ جارج بش کا گرنا امریکہ کے گرنے کی علامتی پیشین گوئی ہے۔

ایک مبصر نے بجا طور پر لکھا ہے کہ تقریباً ۲۰ سال پہلے سابق روسی وزیر اعظم خروشیچین نے اقوام متحدہ میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ کمیونسٹ سرمایہ داری نظام کو دفن کر دیں گے :

Communists would bury capitalism.

مگر کمیونسٹ نظام خود اپنے داخلی تضادات (inner contradictions) کا شکار ہو کر منہدم ہو گیا۔ اب دوسرے سپر پاور امریکہ کے لیے متحدہ یورپ اور جاپان زبردست اقتصادی خطرہ بن کر ابھرے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو انجام سرخ سپر پاور کا ہو چکا ہے وہی انجام سفید سپر پاور کا آئندہ ہونے والا ہے۔

انسان بنیادی طور پر ایک توجیہ پسند مخلوق ہے۔ وہ لازمی طور پر ایک آئیڈیالوجی (نظریہ) چاہتا ہے جس کے ذریعہ وہ کائنات کی توجیہ کرے۔ جس کے ذریعہ وہ یہ متعین کر سکے کہ وہ کیا ہے اور تاریخ میں اس کا مقام کیا ہے۔ اس قسم کی ایک آئیڈیالوجی کے بغیر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ امریکہ کے پاس انسان کو دینے کے لیے اس قسم کی کوئی آئیڈیالوجی نہیں۔ اس کا واحد ایڈوانٹج یہ ہے کہ اس کے پاس ایک قابل عمل معاشی ڈھانچہ (workable system) ہے۔ سوویت یونین کا معاشی ڈھانچہ اس کے مقابلہ میں ناقابل عمل (unworkable) تھا۔ اور یہی اصلاً اس کے انہدام کا سبب بنا۔

تاہم سوویت یونین کے پاس ایک آئیڈیالوجی تھی۔ یہ اگرچہ ایک جھوٹی آئیڈیالوجی (false ideology) تھی۔ مگر اس نے ذریعہ انسان کو ایک فرضی تشکیل حاصل تھی کہ وہ اس پوزیشن میں ہے کہ زندگی اور کائنات کی توجیہ کر سکے۔ سوویت یونین کے انہدام سے یہ بھرم ختم ہو گیا۔ ٹامس آف انڈیا (۱۲ جنوری ۱۹۹۲) میں ایک تجزیہ چمپا ہے، اس کا عنوان ہے : سوویت یونین کے انہدام کے بعد :

The aftermath of the Soviet collapse

تجزیر نگار نے بجا طور پر لکھا ہے کہ سوویت یونین کا انہدام سادہ طور پر صرف ایک ایسا پارک  
 انہدام نہیں۔ یہ درحقیقت جدید انسان کے سوچنے کے ڈھانچے (structure of thinking)  
 میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنے والا ہے۔ یہ تاریخ کے عمل (course of history) کے بارہ میں  
 ہمارے نقطہ نظر (outlook) کو بدل دینے والا واقعہ ہے۔  
 حقیقت یہ ہے کہ اشتراکی ایسا پارک کے انہدام کے بعد عالمی سطح پر ایک نظریاتی خلا  
 (ideological vacuum) پیدا ہو گیا ہے۔ اب دنیا کے سامنے عملاً کوئی نظریہ حیات سہ سے  
 موجود ہی نہیں۔

سوویت یونین کا عمل انہدام اور امریکہ کا امکانی انہدام اب اس درجہ کو پہنچ رہا ہے جس کو ایک  
 مغربی عالم نے جدید تہذیب کا انہدام (collapse of civilization) سے تعبیر کیا ہے۔ انسانی  
 دنیا میں عالم گیر نظریاتی تھلا کا دور آچکا ہے یا کم از کم، وہ بہت جلد آنے والا ہے۔  
 اس صورت حال کے پیش نظر، ٹائٹس آف انڈیا کے مذکورہ تجزیہ نگار نے اپنا مضمون ان  
 الفاظ پر ختم کیا ہے کہ اشتراکیت کو گمراہی لگنے کے بعد لازمی ہے کہ کوئی متبادل نظریہ اٹھے جو ان مسائل  
 کا حل بتائے جو آج انسانیت کو گھیرے ہوئے ہیں :

The ideological vacuum left by the eclipse of socialism is bound to lead to alternative ideological formulations which would assume new relevance in the context of the pressing problems and challenges faced by humanity today.

یہاں خود حالات میں وہ اشارہ موجود ہے جو بتاتا ہے کہ وہ متبادل نظریہ کون سا ہو سکتا ہے جو  
 انسانیت کو اس کی مطلوب چیز دے سکے۔ سوویت یونین میں بسنے والے انسان کو بیک وقت دو  
 تلخ تجربے ہوئے۔ ایک، کمیونسٹ ڈکٹیٹر شپ کی طرف سے پیش آنے والا تشدد۔ دوسرا، مذہب  
 کو اختیار کرنے کے جرم میں مسلسل تعذیب۔ سوویت انسان نے تشدد کی بنا پر کمیونزم کو چھوڑ دیا۔ مگر  
 اسی تشدد کے باوجود وہ مذہب کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔

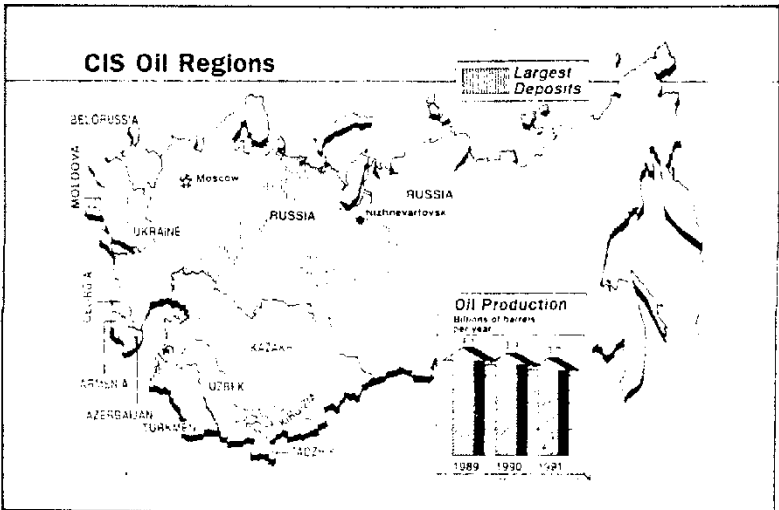
مذہب انسان کی فطری طلب ہے، اور جو چیز فطری طلب ہو اس کو چھوڑنا انسان کے لیے  
 ممکن نہیں۔

## وسط ایشیا

سمرقند وسط ایشیا (سنٹرل ایشیا) کا ایک قدیم مسلم شہر ہے۔ ۱۹۲۸ میں کمیونسٹ فوجوں نے یہاں کے مسلم نواب کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ایک روسی لیڈر نے کتاب لکھی۔ اس کا انگریزی ترجمہ اسی زمانہ میں ”سمرقند کے اوپر صبح“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے :

### Dawn over Samarkand

اس کتاب میں کمیونسٹ مصنف نے فخر کے ساتھ لکھا تھا کہ — سمرقند کا ملاحینتارہا۔ مگر ہماری توپوں کے گولے اس کی صیخ پر بھاری ثابت ہوئے اور ہم نے اس مسلم شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کے ساٹھ سال بعد ایشیا کی ایپارٹ کی حربی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اب اس کے پاس روایتی توپوں کے بجائے ۲۰ ہزار کی تعداد میں ایٹم بم موجود تھے۔ مگر وہ اتنا بے بس ہو کر اپنے بموں کو استعمال کرنے کی طاقت بھی اس کے اندر نہ رہی۔ ایٹم بموں اور دوسرے جدید ہتھیاروں کی کثرت کے باوجود اس کا پورا ڈھانچہ تاش کے پتوں کی طرح ڈھر پڑا۔



اشتراکی صبح نہ صرف سمرقند کے لیے بلکہ پورے سوویت یونین کے لیے صرف اندمیرا ثابت ہوئی۔ ۱۹۹۱ میں سوویت یونین اپنی بدترین کمزوریوں کا شکار ہو کر ٹوٹا تو اسی کے ساتھ نہ صرف سمرقند بلکہ وسط ایشیا کی نصف درجن مسلم ریاستیں (آذربائیجان، قازقستان، کرغیز، تاجکستان، ترکمانستان، ازبکستان) بھی اپنا آزاد ہو گئیں۔ ۱۹۹۱ سے پہلے جہاں سرخ پرچم لہرا رہا تھا وہاں اب ایک وسیع علاقہ میں ایک طاقت ور مسلم بلاک وجود میں آ گیا ہے۔

سوویت یونین کے غلبہ کے زمانہ میں حکومت نے ہر طرح اس علاقہ میں روسی زبان کو رائج کرنے کی کوشش کی تھی۔ سرکاری طور پر روسی زبان کو ثقافتی برتری (Cultural supremacy) دینے کی تمام تدبیریں کی گئیں۔ مگر یہ تدبیریں ناکام رہیں۔ مجھے اپنے سفروس (جولائی ۱۹۹۰) میں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں کے مسلمان روسی کے ساتھ ترکی اور فارسی زبانیں بھی جانتے ہیں اور آپس میں ان زبانوں کو بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کمیونسٹ قبضہ کے بعد روسی تہذیب کو پورے علاقہ میں غالب کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کوشش کو عام طور پر سلاو نائزیشن (Slavonisation) کہا جاتا ہے۔ اس منصوبہ کے تحت مسلمانوں کے اسلامی نام بدلے گئے۔ مثلاً نیاز کو نیازوف، نظر کو نظر بائیوف، سلطان کو سلطانوف وغیرہ۔ سنٹرل ایشیا کے ماہر ڈاکٹر ڈینیئل پائپس (Daniel Pipes) نے لکھا ہے کہ روسی سیاست اور روسی کلچر کی اس توسیع کی بنا پر مغربی ممالک اور وسط ایشیا کو یورپ کی آخری بڑی کالونی (Last great colony) کہنے لگے تھے۔

لندن اور قاہرہ کے درمیان جو فاصلہ ہے وہی فاصلہ ماسکو اور تاشقند کے درمیان ہے۔ تاہم روسی حکمران ۱۵۵۲ء سے ہی اس علاقہ میں سیاسی مداخلت کرنے لگے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں اشتراکی انقلاب کے بعد یہ تدبیریں زیادہ بڑھیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء کے بعد یہاں جدیدی نظم (Iron discipline) قائم کر دی گئی۔

اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۳۹ء میں پورے سوویت یونین میں مسلم آبادی کا تناسب ۸ فی صد سے کچھ زیادہ (8.7 Per cent) تھا۔ اس تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۹۹۰ء میں مسلمانوں کی تعداد ۱۹ فی صد سے زیادہ (19.9 Per cent) ہو گئی۔ اس مدت میں غیر مسلم آبادی میں اضافہ کی

شرح تقریباً ۵ فی صد تھی۔ جب کہ مسلم آبادی میں اضافہ کی شرح، ۲ فی صد تک پہنچ گئی۔ سوویت یونین اگر باقی رہتا تو تقریباً سوویت فوج میں ہر تین فوجی میں سے ایک مسلمان ہوتا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کرفیزریہ کی راجدھانی اوش (Osh) کو دوسرا کہا جاتا ہے۔ آذربائیجان میں شیعوں کی اکثریت ہے۔ مگر مجموعی طور پر اس علاقہ کے مسلمان زیادہ تر سنی ہیں۔

وسط ایشیا کی ان آزاد مسلم ریاستوں کی واحد کمی یہ ہے کہ وہ سمندری ساحل سے محروم (Land locked) ہیں۔ یہ کئی بڑی مسلم ملکوں (ترکی، ایران، پاکستان) کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ترکی سب سے پہلا ملک تھا جس نے الماتا (Alma Ata) کے فیصلہ کے بعد ان ریاستوں کو آزاد ریاست کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ ایران نے اپنی سرحد تک ریلوے لائن بچھانے میں مدد دینے کی پیش کش کی ہے۔ پاکستان نے فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغانستان کے راستے سے پاکستان کی بندرگاہوں تک خشک راستہ (Land route) دینا منظور کیا ہے۔ ان ریاستوں کے لیے ترکی کے راستے سے میڈیٹیرینیئم تک پہنچنا بہت آسان ہے۔

ایک مبصر کے الفاظ میں، یہ علاقہ امکانات سے بھرا ہوا ہے :

The religion is full of possibilities.

ازبکستان کی اس کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ قازقستان میں تیل کے ذخائر ہیں۔ تاجکستان زراعت کے لیے بہت موزوں ہے۔ ترکمانستان میں کیپاس کی پیداوار کے وسیع امکانات ہیں۔ کرفیزریہ زراعت کے وسائل سے مالا مال ہے۔ آذربائیجان میں کثیر تعداد میں تیل کے ذخائر پائے جاتے ہیں۔ ایک مبصر نے کہا ہے کہ اشتراکیت کی موت کے بعد یہ امید کرنا بالکل فطری ہے کہ اس خطے میں اسلامی نظریہ کو قائم کرنے کا رجحان ابھرے گا :

It would be natural to expect that with the death of communism there would be a trend towards establishment of Islamic ideology in the six republics.

حقیقت یہ ہے کہ سابق سوویت یونین کے زیر اقتدار ان مسلم ریاستوں کے آزاد ہونے کے بعد، جغرافیائی نقشہ پر ایک عظیم مسلم بلاک وجود میں آگیا ہے۔ اگر یہ پورا بلاک متحد ہو جائے تو قریبی مستقبل میں بلاشبہ اسلام دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن جائے گا۔

## دروازہ کھلتا ہے

روس میں ۱۹۱۷ میں کیونٹ انقلاب آیا۔ اس کے بعد پورے سوویت روس میں مذہب کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ مذہب کے نام پر تنظیم بنانا، اجتماع کرنا، کتاب چھاپنا، ہر چیز قانونی طور پر ممنوع قرار پائی۔ تاہم نصف صدی کی مجنونانہ مذہب دشمنی کے بعد وہاں کے حالات بدلنا شروع ہوئے۔ اندازہ ہے کہ امریکی صدر مسٹر رونالڈ ریگن کا دورہ ماسکو (۲۹ مئی - ۲ جون ۱۹۸۸) اس اعتبار سے روس میں نئے دور کا آغاز ہوگا۔ ریگن روسی حکمرانوں سے جو بات منوانا چاہتے ہیں۔ ان میں مذہبی آزادی بھی خصوصیت کے ساتھ شامل ہے۔

اس دورہ کے موقع پر ماسکو میں ۶۳ ملکوں کے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار جرمنٹ جمع ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۲۷ میں جب نکسن۔ برزنیف ملاقات ماسکو میں ہوئی تھی تو صحافیوں پر سخت پابندیاں تھیں۔ مگر اس بار انہیں ہر قسم کی کھلی آزادی حاصل رہی۔ یہ روس میں ایک نئے انقلاب کی علامت ہے جس کا آغاز روس کے موجودہ حکمران گورباچیف نے کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ماسکو سے جو خوش آئند خبریں آئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ انٹرنیشنل پولس کے دفتر کے سامنے مختلف چیزوں کی فروخت کا انتظام کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ غیر معمولی چیز بائبل کا روسی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ روس میں مسیحیت کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر چھاپا گیا ہے اور اس کی قیمت ۶۵ ڈالر ہے :

The most unusual buy has to be the modern Russian version of the Bible on sale periodically in the lobby in front of the international press briefing room. Put out to commemorate this summer's 1000th anniversary of Christianity in the Soviet Union, it retails for \$65.

یہ خبر ٹائمز آف انڈیا (۳۰ مئی ۱۹۸۸) میں صفحہ ۷ پر اور ہندستان ٹائمز (۳۰ مئی ۱۹۸۸) میں صفحہ ۱۶ پر شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک بے حد اہم خبر ہے۔ وہ نظامِ مسیحیت کی ہزار سالہ برسی سے تعلق رکھتی ہے، اگر حقیقتاً وہ انٹرا کی روس میں مذہب کے از سر نو احیاء کی علامت ہے۔ یہ خبر بتاتی ہے کہ عارضی وقفہ کے بعد روس میں دوبارہ مذہب کو آزادانہ عمل کے مواقع حاصل ہو گئے ہیں۔

## السيد جمال الدين وجه كل غايته للسياسة

الأستاذ الامام محمد عبده

قال السيد جمال الدين الأفاضلي

ان أهل أوروبا مستعدون لقبول الاسلام ، اذا أحست الدعوة اليه فقد قارنوا بين الدين الاسلامي وبين غيره فوجدوا اليون شاسعا من حيث يسهر العقائد وقرب تناولها ، وأقرب من أهل أوروبا الي قبول الاسلام أهل أمريكا لأنه لا يوجد بينهم وبين الأمم الاسلامية عداوات موروثه ولا أضعاف مدفونة مثلما هو الحال بين المسلمين والاوربيين .

والقرآن من أكبر الوسائل في لفت نظر الافرنج الي حسن الاسلام ، فهو يدعوهم بلسان حاله اليه ، لكنهم يرون حالة المسلمين السوأى من خلال القرآن فيقعّدون عن اتباعه والايامن به ، فاذا أردنا اليوم أن نحمل غيرنا على الدخول في ديننا ، وجب علينا قبل كل شيء أن نقيم لهم البرهان - على أننا متسكون بفصالح الاسلام .. والا لم تكن مسلمين كاملين .

وأفاض السيد في ( بيان ) مزايا القرآن وتعاليمه السامية : من ذلك أنه ( أي القرآن ) أول من دنا على الوصول الي الحقائق بالطريقة الفلسفية وهي ( له ) و ( ولماذا ) ، إذ أن معظم آيات القرآن وارادة في معرض : لم كان الأمر كذا؟ ولماذا كان الأمر كذا؟ وتكليف المخاطبين أن يعطوا الجواب المقبول على هذا السؤال ، وليست الفلسفة سوى ذلك :

قال : ومن مزايا القرآن « أن العرب قبل ازال القرآن عليهم كانوا في حالة هجيبة لا توصف : فلم يفض عليهم قرن ونصف من الزمان حتى ملكوا عالم زمانهم ، وفاقوا أمم الأرض سياسة وعلمنا وفلسفة وصناعة وتجارة ، وكل هذا لعمرى لم ينتج الا عن هدى القرآن - فالقرآن وحده الذي كلن كافيا في اجتذاب الامم القوية وهدايتها جدير أن يكون كافيا اليوم أيضا في اجتذاب الامم الحديثة وهدايتها .

السيد جمال الدين رجل عالم وأعرف الناس بالاسلام ، وحالة المسلمين . وكان قادرا على البع العظيم بالافادة والتنظيم . ولكنه وجه كل غايته الي السياسة فضاء استعداده هذا واننى أعجب لجعل نيهام المسلمين وجراندتهم - كل همهم في السياسة . وإهالهم أمر التربية الذي هو كل شيء ، وعليه يسي كل شيء !

ان السيد جمال الدين كان صاحب اقتدار غيب لو صرفه ووجهه للتعليم والتربية لأفاد الاسلام ذكر فائدة . وقد عرّض عليه حين كما في باريس أن تترك السياسة وتذهب الي مكان بعيد عن مراية الحكومات ، وتعلم وتربي من نخثار من التلاميذ علي مشربنا . فلا تسقى غير سيقن الا ويكون غندا كذا وكذا من التلاميذ الذين يتبعوننا في ترك أوطانهم والسير في الأرض لنشر الإصلاح المطلوب فينتشر أحسن الانتشار ! فقال : انما أنت مشيط !

سید جمال الدین افغانی نے کہا: یورپ کے لوگوں کے سامنے اگر اسلام کی دعوت اچھی طرح پیش کی جائے تو وہ اسلام قبول کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے اسلام اور دوسرے ادیان کا تقابلی مطالعہ کیا تو انھوں نے پایا کہ عقیدہ و عمل کی آسانی کے اعتبار سے دونوں میں بہت فرق ہے۔ اور مغربی اقوام میں قبول اسلام کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب امریکہ کے لوگ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اور اسلامی قوموں کے درمیان اس طرح کی قدیم عداوتیں نہیں ہیں جو مسلمانوں اور یورپی قوموں کے درمیان ہیں۔

اہل مغرب کو اسلام کی طرف متوجہ کرنے کے لیے سب سے بڑا ذریعہ قرآن ہے۔ قرآن کی دعوت اصل اسلام کی طرف ہے۔ مگر وہ قرآن کے حاملین کی بگڑی ہوئی حالت کو دیکھتے ہیں اور اس کی وجہ سے اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ دوسری قوموں کو اسلام کی طرف لے آئیں تو ہر چیز سے پہلے ضروری ہے کہ ان پر برہان قائم کریں، اس طرح کہ ہم اسلام کی صفات پر عامل ہوں۔ ورنہ ہم پورے مسلمان قرار نہیں پاسکتے۔

قرآنی تعلیمات کے فضائل کے بارے میں سید افغانی نے فرمایا: قرآن ہی وہ کتاب ہے جس نے سب سے پہلے فلسفیانہ طریق سے حقائق تک پہنچنے کا راستہ بتایا۔ قرآن کی بیشتر آیات میں اس طرح کے سوالات قائم کیے گئے ہیں: ایسا کیوں، ویسا کیوں۔ اور مخاطب سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس کا معقول جواب دے۔ اور فلسفہ اس کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں۔

انھوں نے کہا: قرآن کے اترنے سے پہلے عرب کے لوگ انتہائی پست حالت میں تھے۔ مگر ان پر ڈیڑھ سو سال بھی نہیں گزرے کہ انھوں نے اپنے وقت کی آباد دنیا کو فتح کر لیا۔ اور دنیا کی قوموں سے سیاست، علم، فلسفہ، صنعت، تجارت ہر چیز میں بڑھ گئے، اور بخدا یہ سب کچھ قرآن کا کرشمہ تھا۔ قرآن تنہا بچھلی قوموں کو کھینچنے اور ان کو ہدایت پر لانے کے لیے کافی تھا۔ وہی آج بھی جدید قوموں کو کھینچنے اور ہدایت دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔

سید جمال الدین ایک بڑے عالم تھے اور اسلام اور مسلمانوں کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کی ذات سے لوگوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ مگر انھوں نے اپنی ساری توجہ سیاست کی طرف موڑ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صلاحیتیں ضائع ہو گئیں۔

مجھے حیرت ہے کہ موجودہ زمانہ میں تمام اعلیٰ صلاحیت کے مسلمانوں اور ان کے جرائد نے اپنی ساری توجہ سیاست کی طرف موڑ دی اور تربیت و تعلیم کے کام کو چھوڑ دیا جو کہ سب سے زیادہ اہم تھا اور جس پر تمام دوسری چیزوں کا انحصار تھا۔

سید جمال الدین عجیب وغریب کمالات کے حامل تھے۔ اگر انھوں نے اپنے آپ کو تعلیم و تربیت کے کام میں لگایا ہوتا تو وہ اسلام کو بہت بڑا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ میں نے یہ بات ان کے سامنے کبھی سنی تھی جب کہ ہم پیرس میں تھے۔ یہ کہ ”ہم سیاست کو چھوڑ دیں اور حکومت کی نظروں سے دور جا کر نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کریں۔ اگر ہم ایسا کریں تو دس برس میں ہمارے پاس ایک ٹیم تیار ہو جائے گی اور وہ ساری دنیا میں اصلاح و تبلیغ کا کام نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دے گی۔“ انھوں نے جواب دیا ”تم تو حوصلہ پرست کرنے والی باتیں کرتے ہو“

یہ اچھے کی بات ہے کہ پچھلے ۲۰ برسوں میں اسلام فرانس کا دوسرا سب سے زیادہ اہم مذہب بن گیا ہے۔ وہ صرف رومن مسیحیت کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ پروٹسٹنٹ مسیحیت سے وہ بہت

## Islam is France's second religion

It is surprising that in the past 20 years Islam has become the second most important religion in France after Roman Catholicism. It is far ahead of Protestantism and mosques served by permanent imams now stand in 17 provincial centres. Roman Catholic churches are often three-quarters empty. But Friday prayers in the Paris Mosque attract between 5,000 and 6,000 people who spill out into adjoining halls and courtyards to listen to the prayers over loudspeakers. For the feast of *Id-ul-Fitr*, which marks the end of Ramadan, the congregation swells to nearly 11,000, and all round the mosque people kneel in the streets. It is estimated that there are 14 million practising Catholics in France as distinct from people baptized as Catholics, who are far more numerous. The Muslims come next with about two million, then protestants with 1,250,000; Jews, who number 900,000, and Buddhists, about 80,000. Before 1939 the Muslim population of France was so small that there were no official statistics of their number. But after the Second World War the Muslim population changed. Many families settled here, particularly from the former colonies in North Africa. Sometimes they had to live in appalling conditions. The wave of immigration increased sharply after 1954 and lasted until 1970. In addition to the families from North Africa, large numbers arrived in France from black Africa. Now the Muslim community consists of mainly working people, and about 250,000 of them live in the Paris region. In Marseilles there are about 750,000, and in Lyons about 300,000. Some are professors, others cannot read or write. The only thing they have in common is their faith in Islam. Speaking about this disparate community, Si Hamza Boubakeur, rector of the Muslim Institute of the Paris Mosque, said: "I realized that I could not afford to stress religious differences, but must give common spiritual nourishment to all, free from any sectarian spirit". He was also confronted with many material problems: housing, jobs, education, and integration into the French community. The women, on whom the family structure is based at first found themselves in a "linguistic prison", unable to communicate. On a wall of his study is a portrait of the Shah of Iran. "The Shah's Government was the only one that helped me materially", he said. "He gave me carpets for the mosque and money". About three-fifths of France's Muslims practice their religion. "The social pressure to worship is not as strong as in a Muslim country and the conditions are not favourable" Si Hamza Boubakeur said. "But many Muslim workers observe Ramadan even on the assembly line".

TIMES (London) March 5, 1978

آگے ہے۔ فرانس کے، اصبوبانی کمزوں میں مستقل اماموں کے ساتھ مساجد قائم ہیں۔  
رومن کیتھولک چرچ اکثر تین چوتھائی خالی رہتے ہیں۔ مگر پیرس کی مسجد میں جمعہ کی نمازوں میں  
پانچ ہزار سے چھ ہزار تک آدمی جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ آنگن اور طرقت کمروں تک بھرے ہوتے ہیں تاکہ  
نماز اور خطبہ کو لاؤڈ اسپیکر پر سن سکیں۔

عید الفطر کا تیوہار جو رمضان کے ختم پر ہوتا ہے، اس میں نمازیوں کا اجتماع گیارہ ہزار تک  
پہنچ جاتا ہے۔ مسجد کے چاروں طرف سڑکوں پر لوگ جھکے ہوئے عبادت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔  
اندازہ ہے کہ فرانس میں ۱۴ ملین عامل کیتھولک ہیں، بمقابلہ پستیم لینے والے کیتھولک کے کہ  
ان کی تعداد زیادہ ہے۔ مسلمان دوسرے نمبر پر ہیں جن کی تعداد تقریباً دو ملین ہے۔ اس کے بعد  
پروٹسٹنٹ ہیں جن کی تعداد ۱۲۵۰۰۰۰ ہے۔ یہودیوں کی تعداد نو لاکھ ہے اور بدھسٹ کی تعداد ۸۰ ہزار ہے۔  
۶۱۹۳۹ سے پہلے مسلم آبادی فرانس میں اتنی کم تھی کہ ان کے بارے میں کوئی سرکاری اعداد و شمار  
موجود نہ تھے۔ مگر دوسری عالمی جنگ کے بعد مسلم آبادی بڑھنا شروع ہوئی۔ بہت سے مسلم خاندان  
فرانس میں آباد ہو گئے، خاص طور پر شمالی افریقہ کے فرانسیسی مقبوضات کے۔ بعض اوقات ان کو  
خوف و ہراس کی حالت میں رہنا پڑتا تھا۔

۶۱۹۵۴ کے بعد ہماجرین کا سیلاب بہت تیزی سے بڑھا۔ یہ سلسلہ ۶۱۹۷۰ تک جاری رہا۔ شمالی  
افریقہ سے آنے والے مسلم خاندانوں کے علاوہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد سیاہ افریقہ سے بھی فرانس  
میں داخل ہوئی۔ اب فرانس کے مسلمان زیادہ تر مزدور طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے تقریباً  
۲۵۰۰۰۰ پیرس کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ مارسیلز میں ۵۰۰۰۰ مسلمان ہیں اور لیونس میں ۲۰۰۰۰۰۔ ان  
میں سے کچھ پروفیسر ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ واحد چیز جو ان میں مشترک ہے وہ  
اسلام کا عقیدہ ہے۔

حمزہ ابو بکر پیرس کی مسجد کے مسلم انسٹی ٹیوٹ کے ریکٹر ہیں۔ مسلمانوں کے اس مختلف النوع طبقہ  
کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا؟ میں نے محسوس کیا کہ میں ان لوگوں کے ذہنی اختلافات  
کو ختم نہیں کر سکتا۔ اس کے بجائے مجھے چاہیے کہ سب کو مشترک روحانی حوراک دینے کی کوشش کروں  
جو کسی ایک کے فرقہ وارانہ مزاج سے آزاد ہو۔

ان کے سامنے بہت سے مادی مسائل بھی ہیں۔ رہائش، روزگار، تعلیم اور فرانس کے معاشرے سے موافقت۔ عورتیں جن کے اوپر خاندانی ڈھانچہ قائم ہوتا ہے، وہ ابتداءً اپنے کو ایک قوم کی سلاخ قید میں پاتی ہیں۔ وہ خارجی دنیا سے ربط قائم نہیں کر پاتیں۔

حسن ابو بکر کے کمرہ کی دیوار پر شاہ ایران کی ایک تصویر ہے۔ شاہ کی حکومت پہلی حکومت تھی جس نے مادی طور پر میری مدد کی۔ انھوں نے کہا: "انھوں نے مجھ کو مسجد کے لیے قالین اور پیر دیا۔ فرانس کے مسلمانوں کی  $\frac{1}{2}$  تعداد مذہبی فرائض ادا کرتی ہے۔ عبادت کے لیے سماجی دباؤ یہاں اتنا زیادہ نہیں جتنا ایک مسلم ملک میں ہوتا ہے اور حالات زیادہ موافق نہیں ہیں۔ حسن ابو بکر نے کہا: "مگر بہت سے مسلم دور رمضان کے روزے رکھتے ہیں حتیٰ کہ پورے مہینے تک کے۔"

موریطانیہ، افریقہ کے شمال مغربی ساحل پر ایک صحرائی ملک ہے۔ اس کا رقبہ گیارہ لاکھ مربع کلومیٹر ہے، فرانس اور اسپین کے مجموعی رقبہ کے برابر۔ مگر آبادی صرف پندرہ لاکھ ہے۔ زیادہ تر باشندے مسلمان ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں یہ ملک فرانس کے قبضے سے آزاد ہوا۔ اس وقت سے یہاں صدر مختار اولد دادا (۵۴) کی حکومت تھی۔ ۱۰ جولائی کو فوجی انقلاب ہوا اور کرنل مصطفیٰ اولد سالک (۴۳) نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ کرنل مصطفیٰ موریطانیہ کی فوج کے سربراہ اعلیٰ تھے۔

موریطانیہ کی اقتصادیات کا انحصار زیادہ تر لوہے کی کانوں پر ہے جو یہاں بڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ ان کانوں کا سارا انتظام فرانسیسی کمپنی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کمپنی خام لوہا نکال کر اس کو نہایت سستی قیمت پر حکومت موریطانیہ سے خریدتی ہے اور اس کو مہنگی قیمت پر باہر فروخت کرتی ہے۔ فرانس کے کارخانوں میں بہ سچ کر جب یہ خام لوہا مشینوں اور سامانوں کی صورت اختیار کرتا ہے تو اس کی قیمت، ابتدائی قیمت کے مقابلہ میں کئی سو گنا بڑھ جاتی ہے۔

آزادی کے بعد ہی سے موریطانیہ میں صدر مختار کے خلاف سیاسی تحریک چل رہی تھی جو بالآخر فوجیوں کے ہاتھوں اٹھارہ برس بعد کامیاب ہوئی۔ مگر اس مدت میں سارے موریطانیہ میں کوئی ایسا رہنما نہ اٹھا جو موریطانیہ کے باشندوں کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس قابل بنانے کی کوشش کرتا کہ وہ اپنی لوہے کی دولت کو فرانسیسیوں سے "چھین" سکیں۔ اپنی قومی حکومت سے سیاسی اقتدار چھیننے میں انھوں نے تیزی دکھائی، مگر فرانسیسیوں سے اقتصادی اقتدار چھیننے کا کوئی منصوبہ وہ نہ بنا سکے۔

یہی تقریباً تمام مسلم ملکوں کا حال ہے۔ ہر رہنما سیاسی کارروائیوں میں دل چسپی دکھا رہا ہے۔ مگر ملک و قوم کی تعمیر و استحکام کے منصوبوں سے ان کو دل چسپی نہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سیاسی کارروائی کے لیے شور و شر کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ جب کہ قومی تعمیر کے لیے خاموش محنت کی ضرورت ہے۔ پہلی صورت میں فی الغور آدمی کی اپنی شخصیت چمکتی ہے جب کہ دوسری صورت میں آدمی کو اپنے آپ کو گم نامی میں دفن کرنا پڑتا ہے۔

آسٹریلیا کا بڑا حصہ صحرا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب کہ یہاں ریلوے لائن نہیں تھی، صحرائی جہاز (اونٹ) یہاں کے راستوں کو طے کرنے کے لیے بہت مفید سمجھے گئے۔ صحرائی بر اعظم کی اس ضرورت نے مسلمانوں کو آسٹریلیا میں روزگار فراہم کیے۔ مگر جب آسٹریلیا میں ریلوے لائن کھینچی گئی تو اس کے بعد مسلمانوں کے لیے وہاں کوئی روزگار نہ رہا۔ روایتی ماحول میں اونٹوں کی نکسیل تھامنے کا کام تھا اور مسلمان اس کی بخوبی جہارت رکھتے تھے۔ غیر روایتی ماحول میں مشینوں کا ہینڈل پکڑنا تھا، مسلمان اپنے کو اس کا اہل ثابت نہ کر سکے۔ ————— قدیم زمانہ میں جو لوگ انسانی قافلوں کے آگے چلتے تھے، جدید دنیا میں وہ صرف پیچھے چلنے والے ہو کر رہ گئے۔

۱۸۶۰ء میں ایک مسلمان آسٹریلیا میں داخل ہوا تھا۔ آج آسٹریلیا میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے۔ ملک میں جگہ جگہ نئی نئی مسجدیں بن رہی ہیں۔ اب ستدائیں جو مسلمان آسٹریلیا پہنچے وہ شتربان (Camel Driver) تھے جو اونٹوں کی نگہداشت اور ساربانوں کے لیے یہاں لائے گئے تھے۔ ۸۰ سال سے زیادہ عرصہ تک مسلمان اسی حیثیت سے آسٹریلیا میں رہے۔

پہلا مسلمان شخص جو آسٹریلیا پہنچا، اس کا نام دوست محمد تھا۔ وہ ایک کشمیری پٹھان تھا۔ اس کے ساتھ ۲۳ اونٹوں کا قافلہ ہوتا تھا اور وہ بلورن اور برک کے درمیان اونٹوں کے ذریعہ سواری اور بار برداری کا کام کیا کرتا تھا۔ ۱۸۶۶ء میں سرٹامس ایڈرنے ۱۲۰ اونٹوں کا قافلہ بنایا۔ اس کو ساربانوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے کراچی سے ۱۲ ساربانوں کو بلا یا۔ اسی طرح افغانستان، ہندستان اور موجودہ پاکستان سے ساربانوں کے کام کے لیے مسلمان آسٹریلیا پہنچتے رہے۔

آسٹریلیا کے لوگ ان مسلمانوں کو عام طور پر "افغان" کہتے تھے جو مختصر ہوتے ہوتے بالآخر صرف فان (Ghans) رہ گیا۔ اونٹوں کے ذریعہ سواری اور بار برداری کا کام اتنا بڑھا کہ ایک باریک وقت

پانچ سو اونٹ باہر سے منگوائے گئے۔ یہ ساربان اپنے مخصوص پیشہ کے ساتھ بعض معمولی تجارتی کام بھی آسٹریلیا میں کرتے تھے۔

اونٹوں کے قافلے زیادہ تر ایڈیلیڈ، فارینا، ماری اوڈناڈٹا اور الاس کے راستوں پر چلتے تھے۔ اس پورے راستے میں ان لوگوں نے جگہ جگہ عبادت کے نئے مسجدیں بنائیں۔ اسی طرح دوسرے جن راستوں پر وہ چلتے تھے، وہاں وہ مسجد بھی بنا لیتے تھے۔ یہ لوگ ہمیشہ اپنے ساتھ چٹانیاں بھی رکھتے اور جہاں مسجد نہ ہوتی، راستہ کے کنارے چٹانی بچھا کر نماز پڑھ لیتے۔

۱۸۷۰ء کے بعد آسٹریلیا کے صحراؤں میں ریلوے لائن کا منصوبہ بنا اور بالآخر ٹرانس آسٹریلیا ریلوے

وجود میں آئی۔ اس ریلوے لائن کے لیے سروے کا جو کام برہمابرس تک ہوتا رہا، اس میں مسلم ساربانوں کے اونٹ بہت کارآمد ثابت ہوئے۔ ان اونٹوں کے ذریعہ سرکاری کارکن اور سامان صحراؤں میں سفر کرتے تھے۔ مگر جب ریلوے لائن بن گئی تو یہی ریلوے تھی جس نے آسٹریلیا میں اونٹوں کو اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کو بے جگہ کر دیا۔ اس کے بعد یہ کاروبار ختم ہونے لگا۔ مسلمان آسٹریلیا سے رخصت ہونے لگے۔ اور مان خان آخری مسلمان تھا جو ۱۹۵۰ء میں آسٹریلیا کو چھوڑ کر اپنے وطن کراچی واپس آگیا۔ اس نے تقریباً ۵۰ سال آسٹریلیا میں گزارے۔

پھر بھی بعض خوش قسمت مسلمانوں کو آسٹریلیا میں روزگار ملتا رہا۔ مثلاً ۱۹۷۵ء میں آسٹریلیا کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ وہ چار اونٹ شاہ خالد (سعودی عرب) کی خدمت میں پیش کرے۔ اس کے لیے حکومت نے محمد عالم اور صالح محمد کی خدمات حاصل کیں، جنھوں نے سمسن صحراؤں سے چار جنگلی اونٹ پکڑے اور ان کو تربیت دے کر اس قابل بنایا کہ وہ سعودی حکمران کو بطور تحفہ پیش کیے جاسکیں۔

مسلم ساربانوں کی خاص شاہراہ وہ تھی جو ایڈیلیڈ سے الاس اپرننگ کو جاتی ہے۔ اس راستہ پر اب جدید وضع کی ٹرینیں دوڑتی ہیں۔ تاہم قدیم ”افغانی ساربانوں“ کے نام پر اس کا نام غان (The Ghan) رکھا گیا ہے۔ اس قسم کی اور بھی یادگاریں ہیں۔ ایڈیلیڈ میں ”افغانوں“ نے ۱۸۸۹ء میں ایک مسجد بنائی تھی۔ اس علاقے میں اب اگرچہ مسلمان نہیں ہیں۔ مگر بروکن ہل ہسٹاریکل سوسائٹی نے ۱۱۵ سال بعد بھی اب تک اس کو محفوظ رکھا ہے۔ اب مسجد کے ساتھ جلد ہی ”افغان میموریل ہال“ حکومت کے اہتمام میں بننے والا ہے۔ یہ ہال اور اس قسم کی دوسری چیزیں دراصل اس بات کا

نشان ہیں کہ آسٹریلیا مسلم ملکوں خاص طور پر عربوں سے تعلقات بڑھا رہا ہے۔ پٹرول نے آج کی دنیا میں عربوں کی اہمیت بڑھادی ہے اور اسی کے ساتھ اسلام کی بھی۔

۱۹۵۱ء سے مسلمانوں کی نئی قسم آسٹریلیا میں داخل ہونا شروع ہوئی ہے۔ یہ مختلف ملکوں کے طلبہ ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں ان کی تعداد تقریباً پانچ ہزار تھی۔ اسی طرح مسلم سفارت خانوں کا عملہ بھی مسلمانوں کی تعداد بڑھا رہا ہے۔ برسبین (Brisbane) میں ۱۹۰۷ء میں ایک مسجد بنائی گئی تھی جو اب خستہ حالت میں تھی۔ اب یہاں کے مسلم طلبہ نے اس کی نئی تعمیر کا منصوبہ بنایا۔ اس کی لاگت کا اندازہ ۷۵ ہزار آسٹریلیائی ڈالر تھا۔ مسجد ۱۹۷۰ء میں بن کر تیار ہو گئی مگر اس کی لاگت اصل اندازہ کے صحت ابلہ میں صرف نصف رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقامی مسلمانوں نے رضا کارانہ طور پر مزدوروں کا کام کیا۔

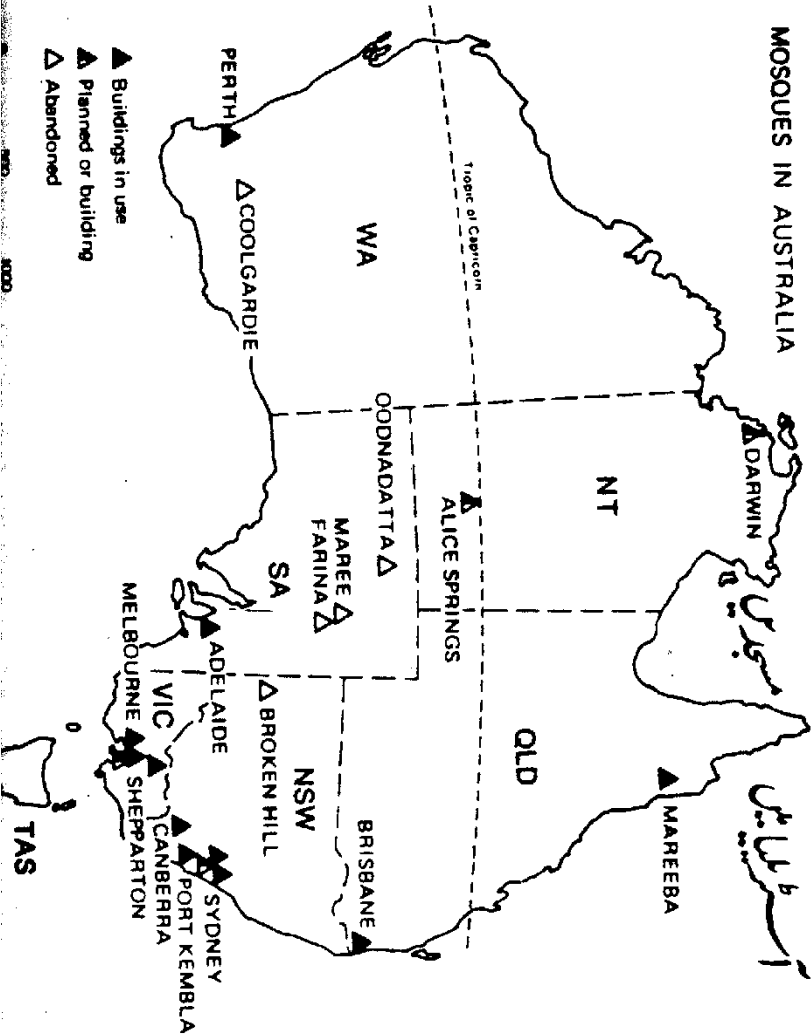
سڈنی نہ صرف آسٹریلیا کا سب سے بڑا شہر ہے بلکہ یہاں مسلم آبادی بھی سب سے زیادہ ہے۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۵۰ ہزار ہے۔ آسٹریلیا کی سب سے بڑی مسجد بھی جلد ہی یہاں مکمل ہو جائے گی۔ اس کی لاگت کا اندازہ پانچ لاکھ آسٹریلیائی ڈالر ہے۔ اسی طرح ملبورن میں پانچ لاکھ آسٹریلیائی ڈالر کی لاگت سے ایک مسجد تیار ہوئی ہے۔ اس کی لاگت زیادہ تر بیرونی مسلم ملکوں کے عطیات سے پوری کی گئی ہے۔ مثلاً صباح، سعودی عرب، بحرین، کویت۔

سعودی عرب نے آسٹریلیا میں مساجد کی تعمیر کے لیے خصوصی طور پر پچاس ہزار ڈالر کی رقم دی ہے۔ آسٹریلیا کے مختلف مقامات پر جو مساجد ہیں، ان کا نقشہ اگلے صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔

یہ معلومات آسٹریلیا ہائی کمیشن کے ایک بلٹین سے لی گئی ہیں جو اپریل ۱۹۷۸ء میں دہلی سے شائع کیا گیا ہے۔ بلٹین کا عنوان ہے :

Muslims in Australia

# MOSQUES IN AUSTRALIA



## اسلام کی طاقت

انجیل میں پیغمبر اسلام کے بارے میں جو پیشین گوئیاں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے :  
ومن بعد یخرج میث ما ضیٰ لکی یضرب بد الامم (یوحنا مارن کا مکتبہ ۱۹، ۱۵) اور قوموں کو مارنے کے لیے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کو جو دین دیا جائے گا اس کی طاقت لوہے کی تلوار نہیں ہوگی بلکہ الفاظ کی تلوار ہوگی۔ وہ نظریاتی طاقت سے قوموں کو زیر کرے گا۔ وہ اس قوت کے ذریعہ کام کرے گا جو زبان سے نکلتی ہے نہ کہ وہ قوت جو کانوں سے اور زمین کی تہوں سے برآمد ہوتی ہے۔

یہ ایک عظیم الشان پیشین گوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری رسول کے ذریعہ جو دین دیا گیا ہے، اس کے حاملین کے لیے کبھی ہتھیار یا بے وسید ہونے کا سوال نہیں۔ وہ اس وقت بھی امکانی طور پر، اعلیٰ ترین طاقت سے مسلح ہوں گے جب کہ ہر قسم کی ظاہری طاقتیں ان سے چھن چکی ہوں گی۔ کیونکہ ان کی طاقت کا راز ان کے دین کی نظریاتی صداقت میں ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کو ان سے کوئی چھین نہیں سکتا۔

یہ پیشین گوئی پیغمبر اسلام کی زندگی میں اپنی مکمل شکل میں پوری ہو چکی ہے۔ آپ کی زبان پر اللہ نے اپنا جو کلام جاری کیا، اس نے قدیم آباد دنیا کے تقریباً پورے علاقہ کو زیر و زبر کر ڈالا۔ کلام الہی کی یہ طاقت آج بھی اپنا کر شہر دکھا سکتی ہے، بشرطیکہ پیغمبر اسلام کے امتیج اس کو لے کر اسی طرح اٹھیں جس طرح ان کے پیش رو اس کو لے کر اٹھے تھے۔

اسلام کی یہ طاقت جس نے قدیم زمانہ میں عظیم الشان بیمانہ پر اپنے اثرات ظاہر کیے تھے، موجودہ زمانہ میں وہ بے اثر کیوں ہو گئی ہے۔ اس کی نفوذ کی صلاحیت کیوں اپنا اثر نہیں دکھاتی۔ اس کی وجہ خود اسلام کے حاملین ہیں۔ مسلمانوں نے اسلام کی فطری کشش پر اپنے عمل سے پردہ ڈالا ہے۔ انہوں نے سیدھے دین کو ٹیڑھا دین بنا رکھا ہے، پھر لوگ کیوں کر اس کی طرف مائل ہوں۔

## نئے امکانات

سفر کی سہولتوں نے موجودہ زمانہ میں بین الاقوامی سیاحت کو ایک مستقل انڈسٹری بنا دیا ہے آج جو لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں سفر کرتے ہیں، ان میں بڑی تعداد سیاحوں کی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں پچھلے چند برسوں کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اندر آنے والے سیاحوں میں تہائی کی تعداد میں وہ لوگ تھے جن کی عمر ۷۰ سال اور ۳۰ سال کے درمیان تھیں۔ ان میں بھی ۲۷ فی صد وہ نوجوان تھے جو اپنے اپنے ملکوں میں تربیت میں یہ سیاحت کی دنیا میں ایک نئی چیز ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے اس قسم کی سیاحت کے لئے زیادہ تر بوڑھے لوگ نکلا کرتے تھے۔

سیاحوں کی فہرست میں نوجوانوں کا اضافہ بہت معنی تیز ہے۔ جوانی کا زمانہ جوش و خروش کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں زندگی اگلوں اور حوصلوں سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ نوجوان، مستحکم سیاحوں سے مختلف ہیں اور کچھ نئی چیزوں کے طالب ہیں۔ قدیم سیاحت آرام دہ ہوئی، ایرکنڈیشنڈ کار اور کھانے پینے کے عمدہ انتظام کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہ نوجوان سیاحت ان چیزوں کی برداہ نہیں کرتے وہ ادسٹرڈ جگہ کے انتظام پر باہل مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ آرام اور فیشن کی تلاش سے زیادہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے لئے ڈاکومنٹری فلم، کچھ اور تعلیم یافتہ کا ٹیڈ کا انتظام ہو جو ان کو ملک کی تہذیب وراثت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات دے سکے۔

اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک اخبار نے اپنے اڈیٹوریل میں لکھا تھا: ”یہ نئے قسم کے سیاحت محض تماشہ نہیں ہیں جو وقت گزاری کی خاطر بیان آتے ہیں۔ ان کے اندر علم کی پیاس ہے۔ وہ ہندوستان کے آرٹ اور کھیل کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں“

انڈین اسپرس، ۱۰ مارچ ۷۲ء

یہ دراصل اس عام روکا ایک نمونہ ہے جو ساری دنیا میں نئی نسل کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ آج کی نئی نسل، فاضل طور پر ترقی یافتہ ملکوں کی نئی نسل، اپنے ماحول سے غیر مطمئن ہے۔ یہ ماحول اس کو مادی مواقع دیتا ہے۔ مگر اس کے ذہنی اور روحانی سوالات کا جواب اس میں نہیں ملتا۔ چنانچہ جدید دنیا میں عام طور پر ماضی کی طرف دیکھنے کا ذہن ابھر رہا ہے جبکہ انسانی سماج مشین کی پیدا کردہ الجھنوں سے پاک تھا۔ آج کا انسان یہ سمجھتا ہے کہ جس سوال کا جواب حال میں موجود نہیں، اس کا جواب شاید ماضی کے خزانہ میں اسے مل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق میں مغربی سیاحتوں کی آمد بڑھ رہی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مشرق میں وہ ماضی ابھی تک محفوظ ہے جو مغرب میں بڑی حد تک ضائع ہو چکا ہے۔

اس صورت حال نے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے۔ مزید یہ کہ بین الاقوامی سیاحتی نعرہ کو خود والی کے پاس پہنچا دیا ہے۔ جن لوگوں کو پانے کے لئے یہیں سمندر پار کا سفر کرنا پڑتا وہ خود ہمارے قریب آ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ مگر دھیولوں کا حال یہ ہے کہ مسلم تاریخی مقامات پر آنے والے سیاحوں کو وہ اپنے لئے تجارت کا مال سمجھتے ہیں، نہ کہ دعوت کا موضوع۔ دہلی کی جامع مسجد میں نماز کے اوقات میں ان کے لئے داخلہ ممنوع ہے۔ حلالان کہ اس وسیع مسجد میں اگر نماز کے وقت غیر مسلم آئیں اور قرآن کے بتائے ہوئے طریق عبادت کو دیکھیں تو یہ ان کو اللہ کا پیغام پہنچانے کے ہم معنی ہوگا اور اس حکم خداوندی کی تعمیل ہوگی جو سورہ توبہ آیت ۶ میں بیان کیا گیا ہے۔

رابطہ عالمی اسلامی (مکر) نے دو سو صفحات پر مشتمل ایک عربی کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے: لِمَاذَا اسلَمْنَا (ہم نے اسلام کیوں قبول کیا) اس کتاب میں موجودہ زمانہ کے ۴۲ نو مسلموں نے خود اپنے قلم سے اپنے حالات لکھے ہیں۔ ان میں سے چند جاپانی ہیں۔ ان لوگوں نے نہایت شدت اور یقین کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جاپان میں اسلام کی اشاعت کے غیر معمولی امکانات ہیں۔

علی محمد موری جاپانی لکھتے ہیں کہ جاپان جزائی طور پر روس اور امریکہ کے درمیان پایا جاتا ہے اس لیے دونوں بلاک جاپانی قوم کے اندر اپنے اثرات پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر دونوں میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں۔ کیوں کہ جاپان کے روحانی سوال کا جواب ان میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپانی نوجوانوں میں نئے آدرش کی تلاش کا جذبہ شدت سے ابھرا۔ اس موقع سے عیسائی مبلغین نے فائدہ اٹھایا اور جاپان کی نئی نسل میں عیسائیت پھیلنے لگی۔ مگر بہت جلد وہ اس سے متوحش ہو گئے۔ کیوں کہ انھیں محسوس ہوا کہ عیسائی مشنریوں کے پیچھے برطانوی اور امریکی استعمار کے مقاصد کام کر رہے ہیں (۱۵۴)

عمریتا جاپانی جنھوں نے جاپانی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا ہے، لکھتے ہیں کہ جاپان میں اسلام کے لیے ایک عظیم مستقبل ہے، جاپانی قوم سچے دین کی پیاسی ہے وہ کسی مذہبی تعصب میں بھی گرفتار نہیں۔ اس لیے اگر اس کے سامنے دین فطرت کو پیش کیا جائے تو وہ بہت تیزی سے اس کی طرف بڑھے گی۔ انھوں نے دنیا کے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ایسے افراد کو جاپان بھیجیں جو اس قوم کو خدا کا سچا پیغام پہنچا سکیں۔ (۱۵۱)

محمد سلیمان تاکیو تیشی جاپانی لکھتے ہیں کہ جاپان کے موجودہ حالات اسلام کی اشاعت کے لیے انتہائی موزوں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاپان مادی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر روحانی مایوسی سے دوچار ہے۔ کیوں کہ یہ ترقیاں اس کی روح کو تسکین نہ دے سکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جاپان میں مناسبت انداز سے اسلام کی اشاعت کی جائے تو صرف دو تین نسلوں میں سارے ملک میں اسلام پھیل جائے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو یہ شرق اقصیٰ میں اسلام کی عظیم نصرت کے ہم معنی ہو گا اور بالآخر ساری نوع انسانی تک اس کے اثرات پہنچیں گے۔ (۱۶۷)

فرانسیسی مفکر اینڈری مارو نے کہلے کہ یورپ کا عروج ۱۳۵۰ء میں شروع ہوا۔ یہ دور پانچ سو برس تک رہا۔ ۱۹۳۹ء میں ماؤ کا برسر اقتدار آنا اس دور کے خاتمہ کا اعلان تھا۔ مغربی تہذیب جس طرح رومی تہذیب کے خاتمہ کے بعد پیدا ہوئی تھی، اسی طرح اب وہ کسی آنے والی تہذیب کے لئے جگہ خالی کر رہی ہے۔ (تمام، ۸ اپریل ۱۹۷۳)

مستقبل قریب میں مغربی تہذیب کا انہدام یقینی ہے۔ اس کے بعد ساری دنیا ایک فکری خلا سے دوچار ہوگی جس کو پُر کرنے کے لئے اس وقت کوئی قوم موجود نہیں ہے۔ چین اور روس بظاہر دور جدید کے طاقت ور دیوبن کرا بھرے ہیں۔ مگر وہ اس خلا کو پُر نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ ان کا اندرونی تضاد ہے۔ اشتراکی ڈکٹیشنپ جس نے ان ملکوں کو موع دیا ہے کہ وہ اپنے وسائل کو مخصوص میدانوں میں مرکز کر کے طاقت ور قوم بن جائیں، وہی اس مانع ہے کہ ان ملکوں میں کوئی فکری ارتقا ر وجود میں آسکے۔ کلیت پسندانہ نظام کے تحت محنتکمل علوم ترقی کر سکتے ہیں، مگر فکری علوم، جو قوموں کو امامت کا مقام دیتے ہیں، ان کی ترقی کے لئے آزادانہ طور پر ضروری ہے جو اشتراکی نظام میں موجود نہیں ہوتی۔

اس کے بعد جاپان ہے۔ بلاشبہ جاپان نے صنعتی ترقی کے میدان میں معجزانہ کارنامے دکھائے ہیں۔ مگر جاپان بنیادی طور پر ایک فنکشنل معاشرہ ہے اور مستقبل بعید تک یہ امید نہیں کہ وہ فکری حیثیت سے کوئی مقام حاصل کر سکے۔

مغربی قوموں کا انہدام، صنعتی تہذیب کے نتائج سے مایوسی اور عمومی فکری خلانے دین حتیٰ کے حاملین کو آج اس مقام پر کھڑا کر دیا ہے کہ اگر وہ بیدار ہو جائیں تو اسلام کو دوبارہ نورا انسان کی امامت کے مقام پر پہنچا سکتے ہیں

اس اعلیٰ مقصد کے لئے جدوجہد میں جو واحد چیز رکاوٹ بن سکتی تھی، وہ جدید صنعتی دور میں وسائل کے اعتبار سے ان کا پیچھے ہونا ہے۔ تاہم قدرت نے تیل کے ذخائر کا تین چوتھائی حصہ ان کی زمین کے نیچے رکھ کر حیرت انگیز طور پر ان کی پس ماندگی کی تلافی کر دی ہے۔ آج مسلم دنیا ہر وہ اقتصادی قیمت ادا کر سکتی ہے جو دور جدید میں اسلام کے احیاء کی موثر جدوجہد کے لئے درکار ہے۔ خدانے اپنے حصہ کا کام کر دیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بندے اپنے حصہ کا کام کرتے ہیں یا نہیں۔“

(ماخوذ از "الاسلام" صفحہ ۳۷-۳۵)

## سیاحت

سیاحت موجودہ زمانہ میں ایک عظیم انڈسٹری ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مختلف قسم کے اعداد و شمار نہایت اہتمام کے ساتھ جمع کئے جاتے ہیں۔ ہر ملک کی وزارت سیاحت ان کا خصوصی مطالعہ کرتی ہے اور ان کی بنیاد پر ترقیاتی نقشے بناتی ہے۔ جدید سیاحت کے ذریعہ انسانوں کی عالمی نقل و حرکت اتنے بڑے پیمانہ پر ہو رہی ہے جس کا اس سے پہلے تصور بھی نہیں کیا گیا تھا۔

ایک تجزیہ میں بتایا گیا ہے کہ عرب ملکوں کے سیاح ہر سال سیاحت پر جو رقم خرچ کرتے ہیں اس کی مقدار گیارہ بلین ڈالر سے اوپر ہے۔ یعنی ہندوستانی سکہ میں تقریباً ایک سو دس کھرب روپیہ یہ رقم دنیا بھر میں سیاحی پر خرچ کی جانے والی کل رقم کا دس فی صد حصہ ہے۔ یورپ میں جانے والا ایک عرب اوسطاً ۸۶۰ پونڈ خرچ کرتا ہے۔ یہ دنیا کے کسی بھی ملک کی فی سیاح خرچ کی جانے والی رقم سے بہت زیادہ ہے۔

قرآن میں سیاحت کو اہل ایمان کی صفت بتایا گیا ہے۔ مگر اس سیاحت کا مقصد صرف دو ہوتا ہے۔ دنیا کے واقعات سے عبرت اور نصیحت لینا یا دعوت و تبلیغ کرنا۔ گویا مومن کی سیاحت دینی سیاحت ہوتی ہے نہ کہ تفریحی سیاحت۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں، خصوصاً عربوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ موقع دیا ہے کہ وہ دنیا بھر میں سفر کریں اور اس کی ہر ممکن قیمت ادا کر سکیں۔ اگر مسلمانوں کے اندر صحیح شعور زندہ ہو تو یہ موقع ان کے لئے زبردست دینی فائدہ کا ذریعہ بن جائے۔

مگر موجودہ حالت میں مسلمانوں کو بے پناہ رقم خرچ کرنے کے باوجود نہ پہلا فائدہ حاصل ہو رہا ہے اور نہ دوسرا فائدہ۔ دنیا بھر کی سیاحت کے باوجود نہ وہ دنیا سے عبرت اور نصیحت کی غذا حاصل کر سکے۔ اور نہ دنیا کے سامنے خدا کے دین کی گواہی دے سکے۔

اس کی وجہ مسلمانوں کی بے مقصدیت ہے۔ آج مسلمانوں کے سامنے کوئی اونچا مقصد نہیں، اس لئے وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ جدید مواقع کو وہ کس طرح اپنے حق میں استعمال کریں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تاملین نے انہیں صرف جموں ٹٹے فزکی غذا دی ہے۔ اور جموں ٹٹے بلاشبہ سب سے زیادہ بری خوراک ہے جو اس دنیا میں کسی کو دی جاسکتی ہے۔ جن لوگوں کے ذہن میں جموں ٹٹے فرما جاتا ہے وہ اپنے آپ کو کچھ کرنے سے باز رہ کر بھرتے ہیں۔ وہ چاہتے لگتے ہیں کہ ان کے لئے کیا جائے نہ کہ وہ دوسروں کے لئے کریں۔

## جاپان میں دعوت

۲۶ اپریل ۱۹۹۱ کو جناب عبدالقادر خاں صاحب (پیدائش ۱۹۳۶) سے ملاقات ہوئی وہ بیہی میں رہتے ہیں (Tel. 2615016) انہوں نے بتایا کہ وہ بین الاقوامی نمائش (Expo 70) کو دیکھنے کے لئے ۱۹۷۰ میں جاپان (ٹوکیو) گئے تھے۔ وہاں وہ ایک ہفتہ تک رہے۔

وہ اپنے گروپ کے ساتھ ٹوکیو ایئر پورٹ پر اترے تو وہاں کچھ جاپانی باشندے پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے پیش کش کی کہ آپ میں سے جو صاحب ہمارے ساتھ قیام کرنا پسند کریں، ان کو ہم اپنے گھر لے جانے کے لئے تیار ہیں۔ عبدالقادر خاں صاحب جاپانیوں کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ اس پیش کش کو قبول کرتے ہوئے وہ ایک جاپانی کے ساتھ چلے گئے۔

عبدالقادر صاحب کو ایک ہفتہ تک اس جاپانی خاندان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ دن کا بیشتر وقت باہر نمائش وغیرہ دیکھنے میں گزرتا۔ شام کو وہ جاپانی کے گھر آجاتے اور رات اس کے یہاں گزارتے تھے۔ چونکہ جاپانی نے اپنے گھر بھرانے کے لئے کوئی معاوضہ نہیں لیا تھا، ان کو خیال ہوا کہ وہ انہیں کوئی تحفہ دیں۔ چنانچہ انہوں نے ٹوکیو میں جاپانی ساخت کا ایک کیرہ خرید اور اس کو اپنے میزبان کے کپڑے کو بطور تحفہ پیش کیا۔

جاپانی میزبان نے تحفہ قبول کر لیا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ یہ کیرہ آپ نے جہاں سے خریدا ہے، اس نے آپ کو اس کی رسید دی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ جاپانی نے بہت نرمی اور شرمندگی کے ساتھ کہا کہ بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ وہ رسید ہم کو دے دیں۔ چنانچہ عبدالقادر صاحب نے وہ رسید انہیں دے دی۔

تاہم عبدالقادر صاحب کے ذہن میں یہ سوال تھا کہ جاپانی نے کیوں ایسا کیا۔ آخر رسید کو لے کر وہ اس کو کیا کرے گا۔ انہوں نے معافی مانگتے ہوئے اپنے جاپانی میزبان سے کہا کہ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو آپ مجھے یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں کہ کیرہ کی رسید کیوں آپ نے طلب فرمائی۔

جاپانی نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ آپ یہاں ٹورسٹ (سیاح) کے طور پر آئے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ قاعدہ ہے کہ ٹورسٹ لوگوں کو جاپانی مصنوعات خصوصی رعایت پر دی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کیرہ

آپ کو چالیس فی صد کم قیمت پر دیگا یا ہوگا۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ کیمرو ملک کے باہر جا رہا ہو۔ مگر اب یہ کیمرو ملک کے اندر رہے گا اس لئے اب اس پر رعایت کا حق باقی نہیں رہتا۔ آپ سے یہ رسید ہم نے اس لئے لی ہے کہ ہم اس کو لے کر دکان پر جائیں گے اور وہاں اس کی بقیہ قیمت ادا کریں گے۔ تاکہ ہماری وجہ سے جاپان کا قومی نقصان نہ ہونے پائے۔

اس قسم کے واقعات بار بار الرسالہ میں آتے رہے ہیں۔ وہ جاپانیوں کے قومی کیکڑ کو بتاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاپانی لوگ کتنے زیادہ با اصول اور با کردار ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جاپان کے باشندے اپنی فطرت پر ہیں۔ وہ اپنے فطری اوصاف پر قائم ہیں۔ اور فطری اوصاف جب شرعی اوصاف کی صورت اختیار کر لیں تو اس کا نام اسلام ہے۔۔۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں فرمایا گیا ہے کہ جاہلیت میں جو لوگ بیترہوں وہی اسلام ہیں کبھی بیترہ ہوتے ہیں اختیار کم فی الجاہلیۃ اختیار کم فی الاسلام،

ایک سفر میں میری ملاقات ایک جاپانی نو مسلم سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ جاپانی لوگ اپنی فطری استعداد کی بنا پر اسلام سے بہت قریب ہیں۔ جاپانی قوم بالقوہ طور پر مسلمان ہی ہے:

Japanese people are potentially Muslims.

آج سخت ترین ضرورت ہے کہ جاپانیوں تک اسلام کی دعوت پہنچانی جائے۔ مگر اس کے لئے جاپانی زبان کو جاننا بہت ضروری ہے۔ کاش ہمارے کچھ نوجوان اس مقصد کے لئے اپنے آپ کو وقف کر سکیں۔ وہ جاپانی زبان سیکھ کر اس میں بخوبی واقفیت حاصل کریں اور پھر جاپان جا کر وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت پہنچائیں۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ ان لوگوں کو فوراً اپیل کرتا ہے جنہوں نے اپنی فطرت کو بچا یا ہو، جنہوں نے اپنی فطرت کو بگڑنے سے محفوظ رکھا ہو۔

## ایک امکان

جان پاول (John Enoch Powell) ایک نہایت ذہین اور قابل انگریز تھے۔ وہ برطانیہ کیڈنٹ میں وزیر صحت تھے۔ بعض اصولی اختلاف کی بنا پر انھوں نے وزارت سے استعفا دے دیا۔ وہ یونانی، لاطینی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور انگریزی زبانیں جانتے تھے۔ جان پاول آزادی سے پہلے ہندوستان میں بھی رہ چکے ہیں۔ وہ برطانوی فوج میں ایک افسر تھے۔ ان کے ایک سوانح نگار نے ان کی بابت حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

Powell spent some years in India as a soldier. He travelled extensively in the country by bicycle and became in his own words "an amateur of Islamic architecture". He learned Urdu and became acquainted with Sanskrit. Of his years in India he wrote later: "I had fallen hopelessly in love with India. If in 1946, there had been a foreseeable future in the Indian army, I would have opted to leave my bones there."

پاول نے کچھ سال ہندوستان میں بطور انگریزی سپاہی کے گزارے۔ انھوں نے بائیسکل کے ذریعہ ملک میں دور دور تک کا سفر کیا۔ وہ اپنے الفاظ میں اسلامی طرز تعمیر کے عاشق ہو گئے۔ انھوں نے اردو سیکھی۔ اردو سنسکرت سے واقفیت پیدا کی۔ اپنے ہندوستان میں زمانہ قیام کے بارہ میں انھوں نے بعد کو لکھا کہ میں ہندوستان کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اگر ۱۹۴۶ء میں ہندوستانی فوج کا جنگی طور پر کوئی مستقبل نظر آتا تو میں اس کو ترجیح دیتا کہ میری ہڈیاں ہندوستان ہی میں رہ جائیں (ٹائٹس آف انڈیا ۵ فروری ۱۹۸۴ء)

انگریزی دور حکومت میں اس طرح کے بے شمار انگریز تھے۔ وہ دعوت اسلام کے امکانی مدعو تھے۔ ان کی فطرت بکار رہی تھی کہ "ہمارے سامنے حق کا پیغام پیش کرو، ہم اس پر تعصب سے خالی ہو کر غور کریں گے۔" مگر ہمارے فائدین کو یہ امکان نظر نہ آیا۔ کیوں کہ انھوں نے انگریز کو حریف کے روپ میں دیکھا۔ وہ ان کو مدعو کے روپ میں نہ دیکھ سکے۔ انھوں نے ان سے نفرت کی مگر وہ ان سے محبت نہ کر سکے۔ انھوں نے ان کو صرف غیر سمجھا، وہ ان کو اپنا سمجھنے کا ثبوت نہ دے سکے۔ وہ رد عمل کی نفسیات کا شکار ہو گئے اور مثبت نفسیات پر قائم ہونے والے نہیں بنے۔ حالانکہ یہ وہ وقت تھا کہ وہ اپنا کام اپنی مادری زبان اردو میں کر سکتے تھے۔

یہ غلطی اگر ایڈٹری کے شوق میں ہوئی تو وہ سب سے بڑا گناہ تھی اور اگر خلاص سے ہوئی تو سب سے بڑی حماقت۔

## دنیا منتظر ہے

واشنگٹن پوسٹ کے مطابق، اس وقت امریکہ میں دس کتاپیں بہت زیادہ بکنے والی (bestseller) بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب یہ ہے :

The Politics of Rich and Poor, by Kevin Phillips

اس کتاب میں مصنف بتاتے ہیں کہ اس وقت امریکہ میں غیر مساوی آمدنی (income disparity) کا مسئلہ بہت شدت اختیار کر چکا ہے جس کو وہ دو ساحلی معاشیات (bicoastal economy) کہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ایک طرف امریکہ میں ایک فی صد سپر مال دار (super rich) طبقہ ہے۔ اس کی آمدنی (\$5,50,000) ڈالر سالانہ ہے۔ دوسری طرف بقیہ لوگ میں جو یا تو بہت کم آمدنی پر زندگی گزارتے ہیں یا مذکورہ طبقہ کے مقروض ہیں۔ مصنف کہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آخر میں اب ہمیں ایک نئی سیاسیات (new politics) کی ضرورت ہے جو نئے امریکہ کی تعمیر کر سکے۔

یہ امریکہ کا حال ہے جو آزاد معیشت کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف سوویت روس کی مثال ہے جہاں مارکسی نظریہ کے مطابق پابند معیشت یا ریاستی معیشت کا تجربہ کیا گیا تھا۔ تمام ذرائع پیداوار افراد کے قبضہ سے نکال کر حکومت کے قبضہ میں دے دیے گئے۔ مگر اس تجربہ کے ستر سال بعد معلوم ہوا کہ اس نے تاریخ کی سب سے زیادہ برباد معیشت کے سوا انسانیت کو اور کبیں نہیں پہنچایا ہے۔ حتیٰ کہ آج روسی حکومت امریکہ اور دوسرے آزاد ملکوں سے ۲۰ بلین ڈالر قرضہ مانگ رہی ہے تاکہ وہ اپنی برباد معیشت کی دوبارہ تعمیر کر سکے۔

اس مسئلہ کا واحد حل ایک ایسا نظام ہے جو سود کے خاتمہ اور زر کوۃ کی اقامت پر مبنی ہو۔ سود کا خاتمہ اس بات کی ضمانت ہے کہ دولت ایک محدود طبقہ میں جمع نہ ہونے پائے۔ اور زر کوۃ اس بات کی ضمانت ہے کہ دولت کی گردش کسی سماج کے دونوں معاشی ساحلوں پر جاری رہے۔ مگر مسلمانوں کی نادانیوں نے لوگوں کی نظر میں اسلام کو ایک تخریبی نظریہ کی حیثیت دے رکھی ہے۔ آج کی دنیا یہ سوچ نہیں سکتی کہ اسلام کے پاس کوئی ایسا تعمیری نظریہ بھی ہو سکتا ہے جو وہ آج کی دنیا کو دے سکے۔

## صفحہ ہجرت

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوة (۲۳ محرم ۱۴۱۲ھ، ۲۳ جولائی ۱۹۹۲ء) میں صفحہ ۱۶ پر ایک خبر کی سرخی یہ ہے : ۴۳ قبیلۃ تعتنق الاسلام فی الفلبین (فلپائن میں ۴۳ قبیلوں کا قبول اسلام)

اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ جنوبی فلپائن کے علاقہ میندناو (Mindanao) کے ۴۳ قبیلوں پرست قبیلوں نے اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اسلام قبول کرنے والے ان قبیلوں میں قبیلہ مانوید بھی ہے جو کہ کیدان وان میں رہتا ہے۔ کیدان وان ایک شہر ہے جو صوبہ کوتاباتو (Catabato) میں واقع ہے۔ ان میں ۲۳۰ وہ اشخاص ہیں جنہوں نے پہلے مسیحیت قبول کر لی تھی، مگر اب وہ سب اسلام میں داخل ہو گئے ہیں۔

یہ صرف ایک مہینہ میں پیش آیا والا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے پچھلے سالوں میں بھی وہاں کے لوگ برابر اسلام قبول کرتے رہے ہیں۔ عرب ملکوں میں کام کرنے والے فلپائن کے لوگوں کے بارہ میں اکثر یہ خبریں آتی رہتی ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

ایک طرف دعوت کے اعتبار سے اسلام کی ترقی کا یہ عالم ہے۔ دوسری طرف اسی فلپائن کے ایک علاقہ میں پچھلے ۲۰ سال سے ”مورولبریشن فرنٹ“ کے نام سے مسلمان سیاسی آزادی کی تحریک چلا رہے ہیں۔ زبردست قربانیوں کے باوجود اب تک اس تحریک کا کوئی بھی قیمت فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ فلپائن کے اس علاقہ میں سات ملین مسلمان رہتے ہیں۔ تعلیم اور اقتصادیات کے اعتبار سے وہ بے حد پیچھے ہیں۔

ستمبر ۱۹۸۹ء میں افریقہ کے ایک سفر میں یہی ملاقات مورولبریشن فرنٹ کے چیئرمین مسٹر نور مواری سے ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ اب تک تقریباً ۱۵۰ ہزار مسلمان اس جدوجہد میں اپنی جان دے چکے ہیں۔ اس کے باوجود دور دور تک بھی کہیں کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ سیاست کے راستے سے کچھ ملنے والا نہیں مگر ساری دنیا میں لاکھوں مسلمان اس کے لیے اپنا جان و مال قربان کر رہے ہیں۔ دعوت کے راستے میں، آج بھی ”سرخ اونٹوں“ کی دولت مل رہی ہے مگر کسی کو اس کی راہ میں عمل کرنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

## نیادور

زمین پوری کائنات میں ایک استثناء ہے۔ یہاں کے وسائل اور یہاں کے امکانات بے پناہ ہیں۔ وہ حسن اور معنویت کی ایک پوری دنیا اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ یہاں وہ سب کچھ اعلیٰ ترین مقدار میں موجود ہے جس کے ذریعہ خوشیوں اور لذتوں کی ایک ابدی تہذیب بنائی جاسکے۔

اس زمین کو سب سے پہلے اس مخلوق کی تحویل میں دیا گیا تھا جس کو جنم کہا جاتا ہے۔ مگر وہ اس عطیہ کے اہل ثابت نہ ہو سکے۔ روایات میں آیا ہے :

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ ابْنُ اُولَىٰ مِنْ سَكَنَ  
الْاَرْضِ الْجَنُّ فَافْسَدُوا فِيْهَا وَسَفَكُوا  
فِيْهَا الدَّمَاءَ وَرَقِلَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا  
ثُمَّ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ فَاَسْكَنَهُ اِيَّاهَا  
فَلَيْدَكَ قَالَ (اِنَّ جَاعِلًا فِي الْاَرْضِ  
حَلِيْفَةً) تفسیر ابن کثیر ۱/۱۰۰

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ زمین پر سب سے پہلے جنات بسائے گئے۔ انھوں نے زمین میں فساد برپا کیا اور خون بہایا اور ایک نے دوسرے کو قتل کیا۔ اس کے بعد اللہ نے آدم کو پیدا کیا اور ان کو زمین پر بسایا۔ اسی لیے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

انسانوں میں کچھ افراد اس آباد کاری کے اہل نکلے۔ مگر انسانوں کی اکثریت اس معاملہ میں نااہل ثابت ہوئی۔ موجودہ زمانہ میں یہ نااہلی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ہے۔ آج پوری دنیا انسانوں کے ظلم اور فساد سے بھر گئی ہے۔ ہر لٹ لوٹ اور قتل کے ہنگامے جاری ہیں۔

یہ صورت حال اشارہ کر رہی ہے کہ غالباً اب زمین پر وہ آخری تبدیلی آنے والی ہے جس کی بابت بائبل میں یہ الفاظ آئے ہیں : صادق زمین کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہے۔ یہاں گے (زبور باب ۳۷) قرآن میں اس کا اعلان ان لفظوں میں کیا گیا ہے : اور زبور میں ہم نعمت کے بعد لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔ بے شک اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے (الانبیاء ۱۰۵-۱۰۶)

خدا کا یہ آخری فیصلہ اس طرح ظاہر ہو گا کہ تمام برے لوگ کاٹ کر پھینک دیے جائیں گے اور عابد اور صالح افراد ابدی طور پر زمین کے مالک ہوں گے۔

## ایک تقابل

ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم نے اسلام اور بدھزم کا تقابل کرتے ہوئے کہا کہ اسلام میں اخلاق کی بنیادیں مکزوری ہیں۔ جبکہ بدھزم میں انسانی اخلاقیات کو بہت مضبوط بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اسلام کے پانچ ارکان (ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) صرف عقیدہ اور عبادت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبکہ بدھزم کے پانچ ارکان (پنچ شیئیل) سب کے سب انسانی اخلاق سے تعلق رکھنے والے اصول ہیں۔ بدھزم کے پانچ ارکان یہ ہیں — قتل نہ کرنا، چوری نہ کرنا، جنسی بے راہ رومی نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا، نشکی چیز استعمال نہ کرنا:

The five precepts (panca-sila) for the layman prohibit killing, stealing, engaging in sexual misconduct, lying, and drinking intoxicating liquor. (3/390)

مگر ایسا بنا درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بدھزم میں جس طرح اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے، اسی طرح اسلام میں بھی اخلاق کی تسلیم دی گئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بدھزم اخلاق کی ملحقین سماجی سلوک کے طور پر کرتا ہے۔ جبکہ اسلام میں متقیانہ روش کی حیثیت سے اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔

اسلام کے پانچوں ارکان میں اخلاق کا تصور بطور تقاضا موجود ہے۔ اسی لئے کہا گیا کہ وہ شخص مومن نہیں جو خود کھانے مگر اس کے قریب کا پڑوسی جھوکار ہے۔ نماز کے لئے قرآن میں ہے کہ نماز آدمی کو فحش اور منکر سے روکتی ہے۔ زکوٰۃ ایک اعتبار سے عبادت ہے اور دوسرے اعتبار سے اپنی چیز میں دوسروں کا حق تسلیم کرنا ہے۔ روزہ کے بارہ میں حدیث میں ہے کہ جو آدمی روزہ رکھ کر جھوٹا بولے اس کا روزہ روزہ نہیں۔ اس طرح اس آدمی کا حج باطل ہو جاتا ہے جو حج کے رسوم ادا کرے مگر اسی کے ساتھ وہ لڑائی جھگڑے میں ملوث ہو۔ قرآن و حدیث میں کثرت سے اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں، اُبْحَثْتُ لِمَا كَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْاِخْلَاقَ اس کو خلاصہ اسلام بتایا گیا ہے کہ آدمی لوگوں کے درمیان اچھے اخلاق کے ساتھ رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بدھزم میں اخلاق کی حیثیت ایک قسم کی اصلاحی سفارش کی ہے۔ جب کہ اسلام میں اس کا رشتہ خدا کے سامنے جو ابدی سے بڑا ہوا ہے۔ جو ابدی کا یہ پہلو اخلاق کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے۔

باب پنجم :

# آدابِ دعوت

داعیانہ اخلاق اور دعوتِ اسلام کے تقاضے

## مقصود کی کردار

۶ ستمبر ۱۹۹۰ء کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو دوسری طرف ایک خاتون انیٹا پرتاپ (Anita Pratap) بول رہی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ نئی دہلی میں وہ ٹائم میگزین (نیویارک) کی اسپیشل کرسپانڈنٹ ہیں۔ اور مجھ سے ”اسلام میں عورت کا مقام“ کے مسئلہ پر معلومات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ مقررہ وقت پر وہ دفتر میں آئیں۔ ان کے پاس انگریزی کا ایک ٹائپ کیا ہوا آرٹیکل تھا۔ یہ اسلام میں عورت کی حیثیت کے بارہ میں تھا، اور اس کا عنوان تھا — پرودہ کے پیچھے :

Behind the veil

گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ یہ آرٹیکل ہمارے پاس ٹائم کے صدر دفتر نیویارک سے آیا ہے۔ ہمارا ایگزیکٹو ایک مضمون چھاپنا چاہتا ہے جس میں عورت کے بارہ میں اسلام کی تعلیمات بتائی جائیں گی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہمارے صدر دفتر نے کچھ مسلم ملکوں میں ٹائم کے نمائندوں کو لکھا کہ وہ موضوع سے متعلق ضروری معلومات حاصل کر کے بھیجیں۔ ان معلومات کو سامنے رکھ کر نیویارک کے ایڈیٹر نے یہ آرٹیکل تیار کیا۔ اب اس آرٹیکل کو دوبارہ مختلف ملکوں میں ٹائم کے نمائندوں کے پاس بھیجا گیا ہے کہ وہ اپنے ہمسایہ کے مستند علماء سے مل کر اس کے اندراجات کی جانچ کریں اور ان کی تصدیق یا تصحیح کر کے دوبارہ صدر دفتر (نیویارک) کو بھیجیں۔ ہماری ان ترسیمات کو سامنے رکھ کر نیویارک کا ایڈیٹر آرٹیکل کو دوبارہ لکھے گا اور اس کے بعد اس کو ٹائم میں چھاپا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کی چیزوں میں ہمارا طریقہ ”چیک اینڈ ری چیک“ کا ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ ایک مضمون کی تیار سازی میں آپ لوگ اتنا زیادہ محنت کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں خاتون کرسپانڈنٹ نے کہا کہ ہمارا ایگزیکٹو (ٹائم انٹرنیشنل) ساری دنیا میں جاتا ہے اور ہر ملک اور ہر قوم میں پڑھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ہم اس کا تحمل نہیں کر سکتے کہ ہم اس میں کوئی غلطی کریں :

We can't afford to make any mistakes.

ٹائم کے نمائندہ کا یہ حملہ سنی آواز سے ٹائم کا مقصد

ضروری ہے کہ اس کا ہر شمارہ لوگوں کو غلطیوں سے خالی دکھائی دے۔ اگر لوگ محسوس کریں کہ اس کی رپورٹیں اور اس کی معلومات غلط ہوتی ہیں تو لوگ اس کی خریداری کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔ ٹائم اپنے پرچہ کو ساری دنیا میں پھیلانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

ٹائم اپنے پرچہ کی غیر مقبولیت کا تحمل نہیں کر سکتا، اس لیے وہ اس کا تحمل بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے صفحات میں ایسی باتیں چھاپے جو غلط یا خلاف واقعہ ہوں۔ اور تجربہ لوگوں کو اس سے دور کر دینے کا سبب بن جائیں۔

یہی نفسیات زیادہ بڑے پیمانے پر دین کے داعی کی ہوتی ہے۔ داعی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے دین کو خدا کے تمام بندوں کے لیے قابل قبول بنائے۔ اس مقصد کے پیش نظر داعی ہر ممکن تدبیر کے ذریعہ اس کا اہتمام کرتا ہے کہ اس کے اور مدعو کے درمیان ایسی کوئی بات پیش نہ آئے جو مدعو کو دین حق سے حیرت کر دے، جس کا نتیجہ اس صورت میں نکلے کہ خدا کا دین مدعو کو مشتتبہ دکھائی دینے لگے، وہ مدعو کی نظر میں قابل قبول نہ رہے۔

اس مقصد کے لیے داعی ہر قسم کی ”غلطی“ سے بچنے کا مکمل اہتمام کرتا ہے۔ وہ مدعو کی پسندیدہ زبان (ابراہیم ۴) میں کلام کرتا ہے۔ وہ دین کو اس کے سامنے قول بیغ (النسار ۶۳) کے اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ وہ مدعو کی زیادتیوں پر ایک طرز صبر (ابراہیم ۱۲) کرتا ہے۔ وہ تالیف قلب (التوبہ ۶۰) کے ذریعہ اس کے دل کو نرم کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو تمام اخلاقی کموریوں سے پاک، المذہب کرتا ہے۔ وہ آخری حد تک مدعو کا خیر خواہ (الاعراف ۶۹) بن جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات وہ ایک صحیح اور جائز بات کے سلسلہ میں بھی مدعو کی ضد کو مان لیتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر مدعو کے اصرار پر لفظ ”رسول اللہ“ کو کاغذ سے مٹا دیا۔

ٹائم میگزین کے نمائندہ نے کہا کہ ہم غلطیوں کا تحمل نہیں کر سکتے۔ یہ بات ایک داعی کو مزید شدت کے ساتھ کہنا ہے۔ داعی کا احساس یہ ہونا چاہیے کہ میں ایسی کسی بات کا تحمل نہیں کر سکتا جو مدعو کو میرے پیغام سے دور کر دے۔ میں ایک طرز طور پر یہ ذمہ داری لوں گا کہ مدعو کو اپنے پیغام حق کے بارہ میں بدٹھن نہ ہونے دوں۔ میں ہر اس قول یا فعل سے بچوں گا جو مدعو کے اندر مخالفانہ نفسیات پیدا کرے اور یہی بات کو اس کے لیے ناقابل قبول بنا دے۔

## دعوت الی اللہ

ایک ہندستانی عالم سعودی عرب گئے۔ وہ ایک دینی جماعت کے سربراہ ہیں۔ وہاں انھوں نے ایک انٹرویو دیا جو ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوة کے شمارہ ۱۹ ذی القعدہ ۱۴۱۲ھ (۲۱ مئی ۱۹۹۲ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک سوال یہ ہے:

س۔ ماہی الانشطة التي تقوم بها جمعيتكم في مجال الدعوة الى الله؟

ج۔ من ابرز انشطة جمعيتنا في مجال الدعوة الاسلامية تنظيم المحاضرات

والندوات والمؤتمرات الاسلامية لمناقشة وضع المسلمين في المهد.

الدعوة کے نمائندہ (فہم السکران) نے سوال کیا کہ وہ کون سی سرگرمیاں ہیں جو آپ کی جماعت دعوت الی اللہ کے میدان میں انجام دے رہی ہے۔ ہندستانی عالم نے جواب میں کہا کہ دعوت اسلامی کے میدان میں ہماری جماعت کی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ نمایاں سرگرمی ہندستان میں مسلمانوں کی حالت کے بارہ میں لکچروں اور سیمیناروں اور کانفرنسوں کا انعقاد ہے۔

یہی موجودہ زمانہ کے علماء اور دانشوروں کا عام ذہن ہے۔ وہ مسلمانوں کے مسائل پر تقریر و تحریر کی سرگرمیاں دکھاتے ہیں اور اس کو دعوت الی اللہ کا کام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کے کسی کام کا دعوت الی اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔

مسلمانوں کی اصلاح یا مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے کوشش کرنا بذات خود ایک مطلوب کام ہے۔ مگر اس کا صحیح نام اصلاح المسلمین ہے نہ کہ دعوت الی اللہ۔ دعوت الی اللہ اسلام میں اس کام کا عنوان ہے جو غیر مسلمین میں اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے انجام دیا جاتا ہے۔

دعوت الی اللہ ایک بے حدنازک ذمہ داری ہے جو غیر مسلموں کے تئیں اہل اسلام کے اوپر مقرر کی گئی ہے۔ یہ کام ہر تپا صبر، غیر خواہی، حکمت اور موعظت حسنہ کے جذبہ کے تحت انجام دیا جاتا ہے۔ اس میں مدعوئی زیادتیوں کو ایک طرف طور پر برداشت کیا جاتا ہے۔ داعی کسی بھی حال میں مدعوئے کوئی توئی یا مادعی نزاع نہیں چھیڑتا۔ یہ وہ کام ہے جس میں ضروری ہوتا ہے کہ داعی فریضہ ثانی کی اشتعال انگیزی پر متعلق نہ ہو۔ وہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دے اور تعصب اور ظلم کے باوجود مدعوئے کے حق میں دعا کرتا رہے۔

## داعی اور مدعو

مسلمان کی حیثیت موجودہ دنیا میں کیا ہے۔ قرآن کے مطابق، مسلمان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ دنیا کی قوموں کے اوپر اللہ کے دین کے گواہ ہیں (لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ) اہل اسلام کی حیثیت کے بارہ میں یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے کہ: **المؤمنون شُھَدَاءُ اللہ فی الارض** (فتح الباری شرح صحیح البخاری ۵/۳۹۹، دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ: **انتم شھداء اللہ فی الارض** (فتح الباری ۳/۲۷۰)۔

گواہی یا شہادت سے مراد وہی چیز ہے جس کے لئے دوسرے مقام پر دعوت الی اللہ یا تبلیغ ما نزل اللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ شہادت کا لفظ اس عمل کے اخروی پہلو کو بتا رہا ہے۔ جو لوگ دنیا میں کسی قوم کے اوپر دعوت و تبلیغ کا کام اس کی تمام مشیروں کے ساتھ انجام دیں گے، ان کو مزید یہ اعزاز حاصل ہو گا کہ قیامت میں جب اس قوم کے ابدی انجام کا فیصلہ ہو گا تو وہاں وہ ان کے سامنے خدائی گواہ کے طور پر کھڑے کئے جائیں گے۔

مسلمان کی اس حیثیت کا تقاضا ہے کہ ان کے اندر داعی والا کردار ہو۔ وہ دوسری قوموں کو مدعو کے روپ میں دیکھیں۔ مسلمان اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ہے نہ کہ قومی حریف اور سیاسی رقیب کا رشتہ۔

قومیں آپس میں مادی اور سیاسی مفاد کے لئے رس کشی کرتی ہیں۔ مگر مسلمان کے لئے اس قسم کا قومی سلوک کسی بھی حال میں جائز نہیں۔ مسلمان کو اس دنیا میں ایک با مقصد اور ایک صاحب نظریہ گروہ کی حیثیت سے رہنا ہے۔ اس کا مزاج دوسری قوموں سے لینے کا نہیں بلکہ دوسری قوموں کو دینے کا ہونا چاہئے۔ مسلمان پر لازم ہے کہ وہ دوسروں کی طرف سے ہمیشہ آنے والی شکایاتوں اور زیادتیوں کو برداشت کرے۔ وہ تمام لوگوں کے ساتھ یک طرفہ حسن سلوک کا معاملہ کرے۔ اس کی ساری توجہ پیغام رسانی پر ہو نہ کہ حقوق طلبی پر۔ وہ دنیا میں غیر خواہ ا اقوام بن کر رہے۔ وہ دنیا کے لوگوں کو ما در ہر بان کی نظر سے دیکھے۔ وہ اپنے لئے جینے کے بجائے دوسروں کے لئے جینے لگے۔

## قانون فطرت

۱۵ جنوری ۱۹۹۶ء کو سہارن پور (امبیٹھ) کے ڈاکٹر شہد صابری سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے حکیم انور صاحب کے حوالے سے ایک واقعہ بتایا۔ حکیم انور صاحب کا مطب امبیٹھ میں ہے۔ ان کا تعلق گنگوہ سے بھی ہے اور وہ اکثر وہاں جاتے رہتے ہیں۔

۱۶:۹۱ء کا واقعہ ہے جب کہ اتر پردیش میں رتھ یا تراکی دھوم تھی۔ حکیم انور صاحب گنگوہ کی ایک سڑک سے گزر رہے تھے۔ اس سڑک کے کنارے ایک صوفی کا مزار ہے جو باپٹری والے پیر کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی وقت ایک مقامی ہندو لالا اشوک بھار دواج (گرو لی رود، گنگوہ) وہاں سے گزرے۔ مزار کے پاس پہنچ کر وہ رکے۔ اپنے روایتی طریقہ کے مطابق، انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ لیے اور دیر تک ادب و احترام کے ساتھ مزار کے سامنے کھڑے رہے۔

لالا اشوک بھار دواج کا تعلق آرائس ایس سے ہے۔ حکیم انور صاحب کو یہ منظر دیکھ کر تعجب ہوا۔ آگے بڑھ کر انھوں نے ان سے کہا کہ لالاجی، عام مسلمانوں کے تو آپ دشمن ہیں۔ مگر اس قبر والے کے سامنے آپ ہاتھ جوڑ رہے ہیں، حالانکہ وہ بھی مسلمان تھے۔ لالا اشوک بھار دواج نے جواب دیا: آپ بھی اس قبر والے مسلمان بیٹے بن جائیے، ہم آپ کے لیے بھی ہاتھ جوڑنے لگیں گے۔

ہندوؤں کا یہ احترام صرف گنگوہ کے مرفون بزرگ کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام ہندوستانی صوفیوں کے لیے ہے جس کا نمونہ جگ جگ ان کے مزاروں پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ صوفیوں اور موجودہ مسلمانوں میں وہ کون سا خاص فرق ہے کہ ہندو موجودہ مسلمانوں سے بیزار ہے اور میں اسی وقت وہ مسلم صوفیوں سے محبت کرتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب صرف ایک ہے — ان مسلم صوفیوں نے ہندو کے مقابلہ میں کبھی کوئی احتجاج یا مطالبہ نہیں کیا۔ جب کہ موجودہ مسلمان پچھلے پچاس سال سے اپنے نااہل لیڈروں کی رہنمائی میں ہندوؤں سے احتجاج اور مطالبہ کی ہم جاری کیے ہوئے ہیں۔

بے نیازی اور قناعت کرنے والے کے آگے لوگ جھکتے ہیں اور شکایت اور مطالبہ کرنے والوں سے لوگ بیزار ہو جاتے ہیں۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور فطرت کے قانون میں کوئی استثناء نہیں۔

## بدو عا نہیں

قال الامام احمد حدثنا ابو النضر حدثنا ابو عقيل حدثنا عمرو بن حمزة عن سالم عن ابيه قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول : اللهم العن فلانا وفلانا ، اللهم العن الحارث بن هشام اللهم العن سهيل بن عمرو اللهم العن صفوان بن امية . فنزلت الآية ( ليس لك من الامر شيء ) اوتوب عليهم اويعد بهم فانهم ظالمون ) فتيب عليهم كلهم - وقال احمد حدثنا ابو معاوية السلافي حدثنا خالد بن الحارث حدثنا محمد بن مجلان عن نافع عن عبد الله ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يدعوا على اربعة فانزل الله ( ليس لك من الامر شيء ) قال وهذا هم الله للاسلام ( تفسير ابن كثير ، الجزء الاول ، صفحہ ۳۰۲ )

ترجمہ : امام احمد نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ( مدینہ میں ) یہ کہتے تھے کہ اے اللہ ، نلال اور نلالاں پر لعنت کر، اے اللہ حارث بن ہشام پر لعنت کر، اے اللہ، سہیل بن عمرو پر لعنت کر، اے اللہ، صفوان بن امیر پر لعنت کر، تو قرآن میں یہ آیت اتری کہ تم کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔ اللہ یا ان کو توبہ کی توفیق دے گا یا ان کو عذاب دے گا، کیوں کہ وہ ظالم ہیں ( آل عمران ۱۲۸ ) پھر ان سب کو توبہ کی توفیق ملی ( اور وہ ایمان لائے ) امام احمد نے ایک اور روایت اس طرح نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ( مشرکوں میں سے ) چار آدمیوں کے خلاف بددعا کرتے تھے تو اللہ نے یہ آیت اتاری کہ تم کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ اللہ نے ان چاروں آدمیوں کو اسلام کے ذریعہ ہدایت دی۔

اس حدیث میں جن کافروں اور مشرکوں کا ذکر ہے ، انہوں نے خود قرآن کے بیان کئے مطابق "ظلم" کا ارتکاب کیا تھا۔ ان کی ربائی اتنی واضح تھی کہ خود پینمبر اسلام کی زبان سے ان کے خلاف لعنت اور بددعا کے کلمات نکلنے لگے۔ اس کے باوجود نہ صرف ایسا ہوا کہ ان کے خلاف لعنت اور بددعا سے روک دیا گیا بلکہ ان سب کے اندر آخر کار نیا ذہن ابھرا، اور ان سب نے اسلام قبول کر لیا۔

## داعی کا طریقہ

اخرج احمد عن رجل من بني مالك بن كنانة قال: رأيتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يسوق ذبي الحجاز يتخللها يقول: يا أيها الناس قولوا لا إله إلا الله تفلحوا. قال أبو جهل يحثي عليه السراب ويقول لا يُغويشكم هذا عن دينكم فأنتم أيريد لستركوا الصمتكم وتتركوا الصلوات والعزائم. وما يلفت اليه رسول الله صلى الله عليه وسلم

(۱۰۸/۱)

امام احمد نے نقل کیا ہے کہ بنو مالک بن کنانہ کے ایک شخص نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے (ہجرت سے پہلے) ذوالحجاز کے بازار میں دیکھا تھا۔ آپ ان کے درمیان چل رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ اے لوگو، کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تم سلاح پاؤ گے۔ راوی کہتے ہیں کہ ابو جہل بھی آپ کے ساتھ تھا۔ وہ آپ پر مٹی پھینک رہا تھا اور یہ کہتا جاتا تھا کہ لوگو، یہ شخص تم کو تمہارے دین سے بہکانے دے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم لوگ اپنے معبودوں کو چھوڑ دو اور لات اور عزی کو ترک کر دو۔ مگر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو جہل کی طرف کوئی توجیہ نہیں فرما رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کا طریقہ کیا ہے۔ جب ایک شخص لوگوں کو اللہ کے سچے دین کی طرف بلانے کے لیے اٹھتا ہے تو وہ لوگ اس کے دشمن بن جاتے ہیں جو جھوٹے دین پر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ طرح طرح سے اس کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ مگر داعی پر لازم ہے کہ وہ ان کی طرف التفات نہ کرے۔ وہ ان کی ایذا رسانی سے اعراض کرتے ہوئے اپنا دعویٰ کام جاری رکھے۔

ابو جہل کی شرابیگری کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر وہ رویہ نمودار ہے جو بزدلی کی بنا پر نہ تھا۔ بلکہ وہ عین بہادری تھا۔ اسی بہادری نے کردار کا نام صبر و اعراض ہے۔ صبر و اعراض دعوت کی لازمی قیمت ہے۔ جو شخص صبر و اعراض کا ثبوت نہ دے، وہ دعوت حق کا کام بھی انجام نہیں دے سکتا۔

## ایک سنت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو جنگی مقابلے پیش آئے ان میں سے ایک جنگ احد (۵۳) ہے۔ اس جنگ میں ابتداءً اہل اسلام کو فتح ہوئی۔ مگر عین اس وقت کچھ مسلمانوں کی غلطی سے رخ بدل گیا اور مسلمان وقتی شکست سے دوچار ہوئے۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے :

فأصيب سبعون قتيلاً وأشرف  
ابو سفيان فقال - أفي القوم محسد -  
فقال لا تجيبوه - فقال أفي القوم ابن  
أبي قحافة - فقال لا تجيبوه - فقال  
أفي القوم ابن الخطاب فقال  
لا تجيبوه - فقال : إن هؤلاء قتلوا -  
فلو كانوا أحياء لأحبا بوا  
(البدایہ والنہایہ ۲/۲۵)

پس مسلمانوں میں سے ستر آدمی مارے گئے۔ اور  
مشرکین کے سردار ابو سفیان نے بلندی سے پکار کر  
کہا۔ کیا قوم کے اندر محمد ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اسے  
جواب نہ دو۔ کہنے والے نے پھر کہا۔ کیا قوم کے  
اندر ابن ابی قحافہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اسے  
جواب نہ دو۔ کہنے والے نے پھر کہا۔ کیا قوم کے  
اندر ابن خطاب ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اسے  
جواب نہ دو۔ اس کے بعد کہنے والے نے کہا :  
کر یہ لوگ مارے گئے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو

ضرور جواب دیتے۔

جنگ احد کے بعد فریق ثانی کی طرف سے اشتعال انگیز باتیں کہی گئیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل اسلام کو ہدایت فرمائی کہ تم لوگ جو ابی انداز اختیار نہ کرو، بلکہ خاموش رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کے مواقع پر مسلمانوں کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔

اس سنت رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے یہیانی مواقع پر اہل اسلام کو رد عمل کا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ وہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ وہ نعرہ کا جواب نعرہ سے نہ دیں۔ اس کے بجائے وہ ایسا کریں کہ ایک طرف طور پر خاموشی اختیار کر لیں۔ اگر وہ اللہ کی خاطر چپ ہو جائیں گے تو اللہ کے فرشتے ان کی طرف سے جواب دیں گے۔ اور جن لوگوں کی طرف سے اللہ کے فرشتے جواب دیں، ان کو زیر کرنا یقیناً کسی کے بس کی بات نہیں۔

## غصہ نہ کرو

قرآن میں اہل ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے غصہ کو اندر ہی اندر پی جاتے ہیں (آل عمران ۱۳۳) اور جن لوگوں کے اوپر انھیں غصہ آیا ہے ان کو معاف کر دیتے ہیں (الثوری ۳۰) اس بات کو حدیث میں مختلف انداز سے بتایا گیا ہے۔ ایک روایت یہ ہے :

عن حمید بن عبد الرحمن عن رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : قال رجل یارسول اللہ اوصنی ، قال : لا تغضب . قال ان رجل - ففکرت حین قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما قال - فبادا الغضب یرجع المش کلہ (مسند احمد)

حمید بن عبد الرحمن تابعی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک صحابی نے انھیں بتایا کہ ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول مجھے نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ غصہ نہ کرو۔ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت پر غور کیا تو میں نے جانا کہ غصہ تمام برائیوں کا مجموعہ ہے۔

انسان کی فطرت نیر پسند ہوتی ہے۔ یہ فطرت ہر انسان کو برائی سے روکتی ہے۔ وہ برائی کے خلاف ایک مستقل چیک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی انسان کبھی نارمل حالت میں برائی نہیں کر پاتا۔ کوئی شخص برائی صفت اس وقت کرتا ہے جب کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آئے جو اس کی فطری حالت کو دہم و برہم کر دے۔

یہ غیر معمولی حالت ہمیشہ انا کے بھرکنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی آدمی کی انا جب بھڑکتی ہے تو اس وقت وہ فطرت کے قبضہ سے نکلی کر غصہ کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔ اور پھر وہ ایسے کام کر ڈالتا ہے جو عام حالات میں وہ کبھی نہیں کر سکتا تھا۔

انسانوں کی یہ تقسیم صحیح نہیں ہے کہ ان میں کچھ نیر پسند ہیں اور کچھ شر پسند۔ زیادہ صحیح تقسیم یہ ہوگی کہ مشتعل انسان اور غیر مشتعل انسان کا لفظ بولا جائے۔ مشتعل ہونے سے پہلے ہر انسان نیر پسند ہی ہوتا ہے۔ البتہ مشتعل ہونے کے بعد وہ شر پسند بن جاتا ہے۔

غصہ پر کنٹرول کرنا تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے اور غصہ کو بھڑکانا تمام برائیوں کا سرچشمہ۔

## بددعا نہیں

ليس لك من الامر شيء اويتوب عليلم او  
 يدبهم فانهم ظالمون - ولله ما في  
 السماوات وما في الارض يضرلن بشاء  
 ويعذب من يشاء والله هنفور رحيم  
 (آل عمران ۲۵-۲۸)

تم کو کچھ اختیار نہیں۔ اللہ یا ان کو توبہ کی توفیق  
 دے یا ان کو عذاب دے۔ کیوں کہ وہ ظالم ہیں۔  
 اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ  
 زمین میں ہے۔ وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس  
 کو چاہے عذاب دے، اور اللہ بخشنے والا مہربان  
 ہے۔

ان دیت سے ثابت ہے کہ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ کافروں اور مشرکوں پر لعنت  
 کی اور ان کے خلاف بددعا کی۔ اس پر یہ آیتیں آئیں۔ اس آیت میں ان کافروں اور مشرکوں کو صاف  
 طور پر ظالم کہا گیا ہے۔ مگر ظالم ہونے کے باوجود یہ تفسیر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اجازت نہیں  
 دی گئی کہ آپ ان پر لعنت بھیجیں اور ان کے خلاف بددعا فرمائیں۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت مختلف روایتیں جمع کی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے آیت  
 کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ یہاں ہم کچھ روایتوں کو مختصر طور پر نقل کرتے ہیں۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر کی دوسری رکعت میں جب رکوع  
 سے سر اٹھاتے تو سمع اللہ من حمدہ کہنے کے بعد یہ کہتے: اللہم انعم فلاناً وفلاناً خیراً  
 فلان اور فلان پر لعنت کر۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور لعنت سے منع کر دیا۔ امام احمد  
 نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے تھے کہ است اللہ۔ عاراً ابن سہام بن سہیل  
 بن عمرو۔ صفوان بن اویہ پر لعنت کر۔ اس پر مذکورہ آیت اتری اور آپ کو لعنت سے منع کر دیا گیا۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین میں سے کچھ لوگوں کو امر کر  
 ان کے خلاف بددعا کرتے تھے۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت آمادی تو آپ سے بددعا بھڑکی  
 امام بخاری نے ایک اور روایت میں نقل کیا ہے کہ خزیمہ اللہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ہونے  
 تو آپ نے کہا: وہ قوم کیسے مسلح ہائے گی جو اپنے نبی کو زخمی کرے۔ اس وقت مذکورہ آیت اتری

اور آپ اپنے قول سے باز آگئے، امام احمد نے روایت کیا ہے کہ غزوة احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کے دانت ٹوٹ گئے اور آپ کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ یہاں تک کہ آپ کے چہرہ پر خون بہہ پڑا۔ آپ نے کہا کہ وہ قوم کیسے مسلح پائے گی۔ جس نے اپنے نبی کے ساتھ ایسا کیا، حالانکہ وہ ان کو ان کے رب کی طرف بلارہا تھا۔ اس وقت مذکورہ آیت اتری، اس کے بعد آپ رک گئے، تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۳۰۳-۳۰۲

سورہ آل عمران کی مذکورہ آیت اور اس کی تشریحی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین اسلام کے کھلے ہوئے ظلم کے باوجود ان پر لعنت کرنا یا ان کے خلاف بددعا کرنا جائز نہیں۔ جارحیت کی صورت میں بشرط استطاعت ان سے دفاع کیا جائے گا، مگر عین اس وقت بھی ان کے خلاف بددعا نہیں کی جائے گی جب کہ وہ میدان جنگ میں اترے ہوئے ہوں۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ انھوں نے پیغمبر خدا کو زخمی کر دیا ہو۔

اسی کا نام داعیانہ اخلاق ہے۔ داعی کو ہر حال میں صبر کا حکم دیا گیا ہے۔ داعی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے دعوے نفرت کرنے لگے۔ مدعو اگر زیادتی کرے تب بھی حکم ہے کہ داعی اس کو برداشت کرے۔ وہ دعا گوئی کی حد تک اس کا خیر خواہ بن جائے۔ داعی کی یہ روکش اس کی دعوت کو طاقت ور بناتی ہے۔ وہ اس کے دعوتی عمل کو تسخیری عمل کے درجہ تک پہنچا دیتی ہے۔

## بصیرت کی اہمیت

آپ صحیح البخاری کھولیں تو اس کی پہلی حدیث وہ طے کی جس کو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے منبر پر بیان کیا تھا۔ اس کا پہلا فقرہ ہے: **إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** اے شک عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔

پھر اسی صحیح البخاری میں، مثال کے طور پر، **مَنْ بَدَأَ الْوَضُوءَ، بِمَنْبَأِ الْوَضُوءِ، بَابُ الْبُؤْلِ تَنَائُفًا وَقَابِعِدًا** کے تحت ایک روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک گروہ کے کوڑا خانہ پر گئے۔ پھر آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا **(إِنِّي السَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبَّاطَةٌ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِمًا)**

اب ایک شخص ہے جو پہلی حدیث کو لے کر اس پر تقریر کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ خالص اللہ کے لیے عمل کرو، اگر تم اللہ کی رضا کے سوا کسی اور چیز کو مقصود بناؤ گے تو تمہارا سارا عمل اکارت ہو جائے گا۔ آخرت میں اسی عمل کی قیمت ہے جو خالص اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا گیا ہو۔

دوسرا شخص وہ ہے جو صرف دوسری حدیث کو لے لیتا ہے۔ وہ لوگوں کے اندر اس بات کی مہم چلاتا ہے کہ لوگ کھڑے ہو کر پیشاب کریں۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے۔

بظاہر یہ دونوں آدمی حدیث پر عمل کر رہے ہیں۔ مگر اس ظاہری مشابہت کے باوجود پہلا آدمی صحیح ہے اور دوسرا آدمی غلط۔ کیوں کہ پہلا آدمی ایک ایسی تعلیم کی اشاعت کر رہا ہے جو عمومی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تعلیم کی جتنی بھی اشاعت کی جائے اس سے دین میں کوئی نقص واقع نہ ہوگا۔ مگر دوسرے آدمی کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ ایک اتفاقی واقعہ کو کلی اور عمومی حیثیت دے رہا ہے۔ ایسا شخص فتنہ کا داعی ہے نہ کہ دین کا داعی۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین کا کام کرنے کے لیے نہ صرف دینی معلومات کافی نہیں، اسی کے ساتھ دینی بصیرت بھی انتہائی طور پر ضروری ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ایک سن علم کے لیے دس من عقل کی ضرورت ہوتی ہے ایک من علم را دہ من عقل می باید

دینی علم کو دینی بصیرت بنانے کا راز تقویٰ ہے۔ جو آدمی تقویٰ اور خشیت والا ہوگا اس کا علم اپنے آپ بصیرت کی صورت میں ڈھل جائے گا۔

## یہ فرق کیوں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قدیم مکہ میں لوگوں کو حق کا پیغام دینا شروع کیا تو لوگوں کی طرف سے نہایت سنت رد عمل ظاہر کیا گیا۔ اس وقت آپ کو ایک طرز طور پر ممبر و اعراض کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ مکہ کے ۱۲ سال تک آپ نے مکمل طور پر اس خدائی ہدایت پر عمل فرمایا۔ آپ ہر قسم کی قوی اور عملی تکلیفوں کو برداشت کرتے ہوئے انہیں اپنی پیغمبرانہ دعوت پہنچاتے رہے۔

دوسری طرف خود پیغمبر اسلام کے حالات بتاتے ہیں کہ آپ نے ان اسلاف پر سخت تنقیدیں کیں جن کو عرب کے لوگ اپنا منتقد اور اپنا مذہبی رہنما سمجھتے تھے۔ مشرکین کو اس پر بہت گڑتے تھے۔ ان کے سردار جب آپ کے چچا ابو طالب کے پاس نبی ہوئے تو ان سرداروں نے ان سے آپ کی جو شکایت کی وہ یہ تھی :

فقلنا لویا اباطالب ان ابن الحنیث  
قد سب آلہتنا و عاب دیننا  
وسفہ اخلامننا و حنثنا ابامننا  
یہ آیتیں ہشام ۲۰۰

انہوں نے کہا کہ اے ابو طالب، آپ کے بیٹے نے ہمارے  
معبودوں کو گالی دی اور ہمارے دین کو عیب لگایا  
اور ہماری عقلموں کو بیوقوف بنایا اور ہمارے قومی  
اکابر کو گمراہ ٹھہرایا۔

سیرت رسول کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ دو باتیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک ہے مدعو کی زیادتی اور اشتغال انجینی کا معاہدہ۔ اس معاملہ میں داعی کو ممبر اور اعراض کا حکم دیا گیا ہے۔ داعی کو ایک طرز طور پر مدعو کی زیادتیوں پر ممبر کرنا ہے۔ داعی کے لیے کسی حال میں جائز نہیں کہ وہ مدعو کے معتادہ میں ردعمل کا انداز اختیار کرے۔

دوسرے معاملہ ان اکابر قوم کا ہے جو مدعو کو وہ کے منتقد اور رہنما بنے ہوئے ہوں۔ جن سے نام لوگ قدرتی رہنمائی حاصل کرتے ہوں۔ اس دوسرے معاملہ میں داعی کو ممبر کے بجائے احتساب کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ اس کو ان فکری رہنماؤں کی رہنمائی پر واضح تنقید کرنا ہے تاکہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا پوری طرح واضح ہو جائے۔ داعی کو یہ تنقیدی کام بہر حال کرنا ہے خواہ مدعو کو وہ اتنا زیادہ برا معلوم ہو کہ وہ داعی کے بارے میں یہ کہنے لگے کہ تم ہمارے اکابر کو گالی دیتے ہو، تم ہمارے بڑوں کا سب و شتم کر رہے ہو۔

## دومنٹ کی بات

لندن کی ایک ٹی وی کمپنی انسائٹ ٹیلی وژن (Insight Television) کی ٹیم امارچ ۱۹۹۳ کو اسلامی مرکز میں آئی۔ انھوں نے کہا کہ ہم ۱۲ منٹ کا ایک ویڈیو پروگرام ریکارڈ کر رہے ہیں۔ اس میں چھ آدمی دو دو منٹ کے لیے بولیں گے۔ یہ پروگرام ساری دنیا میں دکھایا جائے گا۔ ہم آدمی سے ایک سوال کیا جائے گا اور وہ صرف دو منٹ میں اس کا جواب دے گا۔ سوال یہ تھا :

We are today a deeply divided society. To what principle of life should we turn. Hindus and Muslims and others, so that we can live in harmony?

میں نے کہا کہ اس کا جواب بالکل سادہ ہے۔ ایک بچہ آپ سے پوچھے کہ چھ کو گلاب کا پھول لینا ہے۔ لیکن گلاب کے پتھریں کانٹے بھی ہیں۔ پھر میں کیا کروں۔ آپ کہیں گے کہ تم کانٹے سے بچو اور اس کے پھول کو لے لو۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ انسان کے اندر بھی کانٹا اور پھول دونوں ہے۔ ایگو اس کا کانٹا ہے اور کائنات اس کا پھول ہے۔ آپ انسان سے معاملہ کرتے ہوئے ایسا کریں کہ اس کے ایگو کو نہ چھیڑیں۔ آپ ہمیشہ اس کے کائنات کو چمکائیں۔ اس کے بعد سماج میں ہر طرف باریمنی ہی باریمنی دکھائی دے گی۔

ہر آدمی کے اندر فطری طور پر ذہنی کلی ہوتی ہے۔۔۔ ایگو اور کائنات۔ ایگو نفرت کا سورس ہے اور کائنات محبت کا سورس۔ مگر دونوں ہی سونی ہوئی حالت میں ہیں۔ یہ آپ کے اوپر ہے کہ آپ دونوں میں سے کس کو جگانیں۔ اگر آپ نے ایگو کو جگایا تو آپ کو اس سے نفرت اور دشمنی ملے گی۔ اور اگر آپ نے کائنات کو جگایا تو محبت اور دوستی آپ کے حصہ میں آئے گی۔

مدھیہ پر دیش کے ایک ٹاؤن میں ہندوؤں کا جلوس نکلا۔ وہ چلتا ہوا مسلم ایریا میں آیا۔ یہاں مسجد کے امام سے جلوس والوں کی تکرار ہو گئی۔ کچھ مسلم نوجوانوں نے جلوس پر پتھر پھینکے اور چرخہ توڑا اور نفاذ ہو گیا۔ بعد کو امام صاحب کی سمجھ میں آیا کہ نفاذ کا سبب یہ تھا کہ جلوس پر پتھر پھینک کر جلوس والوں کے ایگو کو جہڑ کا دیا گیا۔ انھوں نے طے کیا کہ اب جلوس نکلا تو وہ ان کے کائنات کو جگانیں گے۔

اگلے سال پھر اسی طرح ہندوؤں کا جلوس نکلا۔ جب وہ چلتا ہوا مسجد کے سامنے پہنچا تو امام صاحب پیشگی منصوبہ کے تحت پھولوں کا ہار لے کر باہر آئے۔ انھوں نے جلوس کے ہندو لیڈر سے کہا: ہم آپ کا سوائٹ کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے پھولوں کا ہار لیڈر کے گلے میں ڈال دیا۔

جیسے ہی امام صاحب نے ایسا کیا لیڈر کی گردن انسانیت کے اعزازات میں جھک گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر امام صاحب کو پرنا م کیا۔ اس نے کہا کہ امام صاحب، مسلمانوں کے پتھر مجھ کو نہیں جھکا سکے تھے، مگر آپ کے پھولوں نے مجھ کو جھکا دیا۔ اب تک میں آپ کو دشمن کے روپ میں دیکھتا تھا۔ مگر آج سے آپ میرے دوست ہیں۔ اور یہ دوستی اب کبھی ٹوٹنے والی نہیں۔

دونوں میں فرق کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کا پچھلا رویہ لیڈر کے ایگو کو جگانے والا تھا۔ امام صاحب کے موجودہ رویہ نے لیڈر کے کائنات کو جگا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے سال جہاں بندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کو مارا تھا، وہیں دونوں ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ کل کے دشمن آج کے بھائی بھائی بن گئے۔

دونوں واقعات میں فرق کیا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ بستی کے مسلمانوں نے اس سے پہلے جلوس والوں کی انا کو بھڑکایا تھا۔ اب انھوں نے جلوس والوں کے ضمیر کو جگا دیا۔ انا نفرت کا سرچشمہ ہے اور ضمیر محبت کا سرچشمہ۔ انا سے آگ اور دھواں نکلتا ہے اور ضمیر سے خوشبو اور ٹھنڈک۔ انا انسانیت کو توڑنے والی ہے اور ضمیر انسانیت کو جوڑنے والی۔

عام طور پر لوگ انسانوں کو اچھے اور برے کے خانے میں بانٹتے ہیں، وہ کچھ انسداد کو دوست سمجھ لیتے ہیں اور کچھ اور افراد کو دشمن۔ مگر یہ تقسیم مصنوعی ہے۔ اپنی ابتدائی فطرت کے اعتبار سے تمام انسان صرف انسان ہیں۔ وہ اپنی اصل فطرت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے لیے بے ضرر ہیں۔ ہر انسان اپنے ذاتی مفاد میں اتنا مشغول ہے کہ اس کو دوسرے کے ساتھ دشمنی کرنے کی فرصت نہیں۔

اس کے باوجود دشمنی کیوں پیدا ہوتی ہے۔ دشمنی ایک استثنائی حالت ہے نہ کہ عام اور معتدل حالت۔ دشمنی ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ قول یا عمل سے کسی کے غصہ کو بھڑکایا جائے۔ اگر آپ آدمی کے اندر سوائے ہونے غصہ کو نہ بھڑکائیں تو آپ اس کے نقصان سے بھی لازمی طور پر بچے رہیں گے۔

## ناقابل معافی

حدیث میں آیا ہے کہ ایک لڑائی میں ایک مسلمان کے سر پر زخم آ گیا۔ وہ زخمی حالت میں تھا کہ اگلی صبح کو اسے غسل کی حاجت ہوئی۔ پانی سر پر ڈالنا سخت مہلک تھا۔ اس نے دوسرے مسلمان ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ پانی کی موجودگی میں ہم تیرے لئے کوئی گنہگار نہیں پاتے۔

مسلمان نے جب دیکھا کہ دوسری کوئی راہ نہیں ہے تو اسی حالت میں اس نے غسل کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی حالت نازک ہو گئی اور وہ مر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ کو بے حد دکھ ہوا۔ آپ نے فرمایا: قتلواہ قتلہم اللہ (انھوں نے اس کو ہلاک کر ڈالا، خدا انہیں ہلاک کرے)

مذکورہ مسئلہ واضح طور پر اجتہادی تھا۔ اس کے باوجود آپ نے ان کے بارہ میں اتنے سخت الفاظ فرمائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجتہاد میں غلطی کی معافی کی بھی ایک حد ہے۔ عام حالات میں اجتہادی خطا پر پکڑا نہیں ہے۔ مگر جب معاملہ زیادہ نازک ہو جب ایسا مسئلہ درپیش ہو جس سے آدمی کی زندگی اور موت وابستہ ہو جائے تو اسی حالت میں اجتہادی رائے پیش کرنے سے بچنا چاہئے۔ ایسے موقع پر اجتہادی رائے دینا اور اس پر اصرار کرنا بے حسی کی بات ہے اور بے حسی ایمان کی موت کی نشانی ہوتی ہے۔ اوپر کی حدیث صرف ایک ایسی اجتہادی غلطی سے متعلق ہے جس کا نقصان انفرادی سطح پر ظاہر ہوا ہو۔ پھر یہی بات مزید شدت کے ساتھ ان واقعات کے بارہ میں صادق آتی ہے جب کہ کوئی قائد ملت کو ایسی اجتہادی رائے پر دوڑا دے جس کا نتیجہ ملت کے لئے اجتماعی ہلاکت کی صورت میں برآمد ہوا ہو۔

”غسل کے وقت آدمی کا رخ قبلہ کی طرف ہو یا نہ ہو“ اس مسئلہ میں مفتی اگر غلط فتویٰ دیدے تو اس میں کسی کے لئے جان و مال کے نقصان کا اندیشہ نہیں۔ مگر ایک شخص جو شدید طور پر زخمی ہے وہ غسل کرے یا نہ کرے، اس معاملہ میں غلط فتویٰ سے آدمی کی جان خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ اس لئے دونوں قسم کے مسائل پر غلطی کا معاملہ یکساں نہیں ہے۔ پہلی قسم کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے جس میں اجتہادی غلطی پر بھی آدمی کو حسن نیت کا ثواب مل سکتا ہے۔ مگر دوسری قسم کے مسئلہ میں اجتہادی غلطی کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ نازک معاملات جن کے ساتھ فرد اور قوم کی قسمتیں ہوں، ان میں مفتی کے لئے لازم ہے کہ وہ آخر وقت تک چپ رہے۔ اور اگر بولے تو اس وقت بولے جب کہ فی الواقع وہ خدا کے سامنے اس کے لئے بری الذمہ ہو چکا ہو۔

## ردِ عمل

سید نورسی (۱۹۶۰-۱۸۷۳) ترکی کے ایک عالم اور مجاہد تھے۔ وہ بے حد ذہین اور قابل آدمی تھے۔ ترک حکومت کے خلاف ان کے پرجوش بیانات کی وجہ سے حکومت ان کی مخالفت ہو گئی۔ وہ گرفتار کر لیے گئے۔ وہ فوجی عدالت کے سامنے پیش کیے گئے۔ وہاں انھوں نے بیان دیتے ہوئے کہا:

لوان لی الف۔ روح لما ترددت ان اجملها  
فداء لحقیقة واحدة من حقائق  
الاسلام۔  
اگر میرے پاس ایک ہزار روح ہوتی تب بھی میں  
اس سے زچکچکاتا کہ ان سب کو اسلام کی حقیقتوں  
میں سے کسی ایک حقیقت کے لیے قربان کر دوں۔

رد عوة الحق، رباط، نومبر ۱۹۸۵، صفحہ ۸۰

سید نورسی تسلیم اور مطالعہ میں مشغول تھے کہ ایک واقعہ گزرا جس نے ان کی زندگی کو مجاہدانہ زندگی بنا دیا:

وفي هذه الاثناء ترا ابدیع السلمان في  
الجزائر المحلّية ان وزير الاستعمرات  
البريطاني غلا دستون صرح في مجلس  
العموم البريطاني وهو مخاطب النواب و  
بيده نسخة من القرآن الكريم قائلاً:  
مادام هذا القرآن بيد المسلمين فلن  
نستطيع ان نكسهم. لذلک فلا ماص  
لنا من ان نزيله من الوجود او نقتطع  
صلة المسلمين به۔  
(صفحہ ۷۸)

(۱۸۹۳ کے دوران، بیرم الزمان سید النورسی  
نے بعض مقامی اخبارات میں پڑھا کہ برطانیہ کے  
وزیر نوآبادیات گلڈ اسٹون نے برطانی دارالعوام  
میں تقریر کی۔ ان کے ہاتھ میں قرآن تھا اور انھوں  
نے نمائندگان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ  
جب تک یہ قرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے  
گا ہم ان کے اوپر اپنا حکم نہیں چلا سکتے۔ اس  
بنیاد پر ہمارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں  
کہ یا تو اس کتاب کا وجود مٹا دیں یا مسلمانوں کا  
رشتہ اس سے کاٹ دیں۔

سید نورسی کے اندر یہ تڑپ نہیں اٹھی کہ وہ گلڈ اسٹون کو گمراہی سے نکالیں اور

اس کو جنت کا راستہ دکھانے کی کوشش کریں۔ البتہ اس نے سید نورسی کی مقدس کتاب کی توہین کر دی تو وہ بھڑک اٹھے۔ یہی موجودہ زمانہ میں تمام مسلم شخصیتوں کا حال رہا ہے۔ مثبت مقصد کے لیے وہ نہ اٹھ سکے۔ البتہ رد عمل کے جذبہ کے تحت وہ کبھی ایک کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے اور کبھی دوسرے کے خلاف۔

اسلام مثبت حقیقتوں کا دین ہے۔ وہ رد عمل کے تحت بھڑک اٹھنے کا نام نہیں۔ مومن وہ ہے جو خدا کی عظمتوں کو دریافت کرے اور اس میں جینے والا بن جائے۔ وہ کائنات میں خدا کی نشانیوں کو پڑھے اور اس کے ذہن میں ربانی علوم کا چشمہ پھوٹ نکلے۔ وہ غیب کے پردہ کو پھاڑ کر جنت اور جہنم کو دیکھ لے اور پھر شدید ترین طور پر اس بات کا حریف بن جائے کہ خدا اس کو جہنم کی آگ سے بچانے اور اس کو جنت کے باغوں میں داخل کرے۔

اسی معرفت کا نام ایمان و اسلام ہے۔ اور یہ ایمان و اسلام اپنی آخری انتہا پر پہنچ کر دعوت بن جاتا ہے۔

سید نورسی نے پرجوش طور پر کہا تھا کہ اسلام کی باتوں میں سے کسی ایک بات کا مسئلہ بھی ہو تو وہ اس کے لیے اپنا پورا وجود صرف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بظاہر ان کے یہ الفاظ تمام اسلام کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس کا تعلق صرف جزئی اسلام سے ہے نہ کہ کلی اسلام سے۔

ایک غیر مسلم شخص کا قرآن کے خلاف گستاخی کرنا اسلام کے مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے اسی طرح اسلام کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ اس غیر مسلم کو اور اس کے جیسے دوسرے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت پہنچائی جائے۔ سید نورسی اور ان کے جیسے دوسرے لوگ اول الذکر اسلامی مسئلہ کے لیے تو بہت تڑپے۔ مگر ثانی الذکر اسلامی مسئلہ کے لیے ان میں سے کسی کے اندر تڑپ پیدا نہیں ہوئی۔ یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلم مجاہدین کا معاملہ ہے۔ وہ دوسروں سے نفرت کرنے کے مجاہد بنے، مگر وہ دوسروں سے محبت کرنے کے مجاہد نہ بن سکے۔ لوگوں کو جہنم میں داخل کرنے کے لیے انہوں نے بہت سرگرمی دکھائی، مگر وہ اس کے لیے سرگرم نہ ہو سکے۔ لوگوں کو خدا کی رحمتوں کے سایہ میں پہنچائیں۔

## کمی یہاں ہے

نیتاجی سبھاش چندر بوس نے ۱۹۴۳ میں آزاد ہند فوج (Indian National Army) بنائی تھی۔ اس کا مقصد انگریزوں سے لوکر ہندستان کو آزاد کرانا تھا۔ یہ فوج رنگون میں بنائی گئی۔ مگر قبل اس کے کہ وہ ہندستان میں داخل ہو انگریزی فوج کے بری دستے نے اسے ختم کر دیا۔ آزاد ہند فوج کے تین خاص کمانڈر تھے۔ ڈھلویں، سہگل اور شاہ نواز۔ ان لوگوں پر لال تلوار کی ایک عدالت میں غداروں کا مقدمہ چلایا گیا جس کی وکالت مدعی علیہ کی طرف سے جو اہر لال نہرو نے کی تھی۔ اسی زمانہ میں ایک شاعر کا یہ شعر بہت مشہور ہوا تھا:

لال متلے سے آئی آواز ڈھلویں، سہگل، شاہ نواز

کرنل گور بخش سنگھ ڈھلویں (عمر ۵۵ سال) اب شیوپوری (مدھیہ پردیش) میں رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی دہلی آتے ہیں۔ پرومیلا کلہن نے ان سے ایک انٹرویو لیا جو ہندستان ٹائمس (۱۶ مئی ۱۹۸۸) میں چھپا ہے۔ اس انٹرویو میں انھوں نے جو باتیں بتائیں ان میں سے ایک بات مطبوعہ انٹرویو کے مطابق یہ تھی کہ ہندوستانیوں اور ایشیائیوں نے فیائنڈز طور پر نیتاجی سبھاش چندر بوس کی مالی مدد کی۔ رنگون کے ایک مسلمان تاجر نے تنہا ان کو ایک کروڑ روپیہ دیا:

A cosmetic manufacturer, a Muslim in Rangoon, gave a crore of rupees (p.10).

۱۹۴۴ کا ایک کروڑ روپیہ آج کے لحاظ سے ۵۰ کروڑ روپیہ سے بھی زیادہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے سیاسی اور قومی کاموں میں بہت بڑا بڑا تعاون دیا ہے۔ اور بے شمار سرمایہ خرچ کیا ہے۔ مگر دور جدید کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال نہیں جب کہ مسلمانوں نے دعوت الی اللہ کے کام میں کوئی بڑا تعاون کیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ نفرت اقوام کے لیے اٹھے مگر وہ محبت اقوام کے لیے نہ اٹھے سکے۔ یہی واحد سبب ہے بڑا سبب ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے سارے معاملات کو برباد کر رکھا ہے۔ جب تک وہ اپنے اس مزاج کو نہ بدلیں، کسی بھی دوسری تہذیب سے ان کے حالات بدلنے والے نہیں۔

## نفرت، محبت

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کے اصحاب بھی وہاں موجود تھے۔ اتنے میں ایک اعرابی (دیہاتی گنوار) وہاں آیا۔ وہ مسجد کے اندر ایک جگہ کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ اس کو پکڑنے اور مارنے کے لیے دوڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا کہ اسے چھوڑ دو۔ جب اعرابی پیشاب کر چکا تو آپ نے صحابہ سے کہا کہ ایک بالٹی پانی لو اور جہاں اس نے پیشاب کیا ہے وہاں پانی بہا کر اس کو صاف کر دو۔ اس کے بعد آپ نے اعرابی کو بلایا اور نرمی کے ساتھ اس سے کہا کہ دیکھو یہ مسجد ہے۔ یہاں خدا کا ذکر اور عبادت کی جاتی ہے۔ یہ بول و برا کرنے کی جگہ نہیں۔

اعرابی پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا۔ ابتدا میں اگر اس کا گنوار پن جاگا ہوا تھا تو اب اس کا ضمیر جاگ اٹھا۔ وہ اسی حالت میں اپنے قبیلہ میں واپس گیا۔ وہاں وہ دیوانہ وار لوگوں سے کہتا پھرتا تھا کہ دیکھو، میں مدینہ گیا۔ وہاں میں نے یہ گندا کام کیا کہ محمد کی مسجد میں پیشاب کر دیا۔ مگر انہوں نے صرف یہ کیا کہ جہاں میں نے گندا کیا تھا اس کو پانی سے دھو دیا۔ خدا کی قسم محمد نے نہ مجھ کو بھڑکا اور نہ وہ میرے اوپر غصہ ہوئے (واللہ ما زجرنی محمد، واللہ ما قہرنی محمد) اعرابی کا یہ کہنا اس کے قبیلہ والوں کے لیے اسلام کی تبلیغ بن گیا۔ چنانچہ پورا پورا کاپورا قبیلہ اسلام کے دین میں داخل ہو گیا۔ جس قبیلہ کے ایک آدمی نے مسجد میں آکر پیشاب کر دیا تھا، اسی قبیلہ کے تمام آدمی دوبارہ مسجد میں اس لیے آئے کہ مسجد کا احترام کریں اور اس میں ایک خدا کے آگے سجدہ کر کے اپنی اطاعت و فرمان برداری کا اظہار کریں۔

یہ دور رسالت کا واقعہ ہے۔ اب موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے۔ ۱۸۳۱ء میں سید احمد شہید بریلوی کو زبانی طور پر یہ خبر ملی کہ پنجاب کے ہمارا جد رنجیت سنگھ نے پنجاب کی کچھ مسجدوں کو اہطل بنا دیا ہے۔ وہاں اس کے گھوڑے بندھے ہوئے ہیں۔ اس خبر کے بعد انہیں کس مزید تحقیق کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بہت سے مسلمانوں کو لے کر پنجاب پہنچے اور رنجیت سنگھ کی فوجوں سے لڑ گئے۔ اس لڑائی میں ہزاروں مسلمان مارے گئے۔ ایک تذکرہ نگار کے الفاظ میں، پنجاب کی زمین مسلمانوں کے

خون سے لالہ زار ہو گئی۔

۱۸۵۷ء کے غدر (دیا جنگ آزادی) میں یہ واقعہ ہوا کہ مسلمان اس بات پر بھڑک اٹھے کہ انہیں وقت کے حکمرانوں کی طرف سے ایسے کار توں دیئے گئے ہیں جن میں خنزیر کی چربی لگی ہوئی ہے۔ یا کچھ انگریز سپاہی اپنے گھوڑوں پر چڑھ کر کسی مسجد کے اندر داخل ہو گئے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں نے انگریزوں سے جو لڑائی لڑی، اس میں لاکھوں مسلمان مارے گئے۔ بے شمار مسلمانوں کا خون بہا۔ مگر سب کچھ لا حاصل، کیوں کہ جو صورت حال تھی، وہ بدستور مزید شدت کے ساتھ برقرار رہی۔

اس وقت سے لے کر اب تک لڑائی بھڑائی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ مسلمان ہر طرف اپنا خون بہا رہے ہیں۔ غیر قوم کا کوئی شخص مسجد کی دیوار پر رنگ ڈال دے۔ کوئی مسجد کے سامنے غلط نعرے لگا دے۔ کوئی جسوس باجا بجاتا ہوا مسجد کی سڑک سے گزر جائے۔ اس طرح کا کوئی واقعہ ہو تو مسلمان مشتعل ہو کر لڑ جاتے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان فساد ہوتا ہے گولیاں چلتی ہیں۔ بے شمار لوگ مارے جاتے ہیں۔ اس طرح کے جھگڑے اور لڑائیوں میں مسلمانوں کا خون بہتا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کو ناپنے کے لیے بالٹی کی نہیں بلکہ ڈرم کی ضرورت ہوگی۔ مسلمانوں کے اپنے بیان کے مطابق سڑکوں پر مسلمانوں کا خون بہ رہا ہے۔ بستیاں مسلمانوں کے خون سے سُرخ ہو رہی ہیں۔

اب دیکھیے کہ یہ سارا خون جو بہایا جا رہا ہے اس کا فائدہ کیا ہے۔ کیا اس کی وجہ سے خدا کے بندے خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ کیا اس کی وجہ سے اسلام کے دشمن اسلام کے دوست بن رہے ہیں۔ کیا اس کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے کہ توہین اور قبیلہ اسلام میں داخل ہو کر اسلام کی طاقت بن جائیں۔

ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ مسلمانوں کے خون کا سیلاب ایک سو سال سے بھی زیادہ مدت سے بہ رہا ہے۔ مگر کوئی بھی شخص نہیں جس کی روح کو خون کے س دریا نے پاک کیا ہو۔ کوئی ایک آدمی نہیں جو اس خون کی وجہ سے مسلمانوں کے دین میں داخل ہوا ہو۔ کوئی ایک قبیلہ نہیں جس نے مسلمانوں کے اس عین کو دیکھ کر ایسا کیا ہو کہ وہ خدا کی نافرمانی کو چھوڑ کر خدا کا مومن و مسلم بن جائے۔

یہ فرقی کیوں ہے۔ دور رسالت میں پانی نے جو نتیجہ دکھایا تھا۔ بعد کے دور میں خون بھی وہ نتیجہ

نہ دکھاسکا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا پانی محبت کا پانی تھا۔ اور موجودہ مسلمانوں کا خون نفرت کا خون ہے۔ رسول نے انسان کے اوپر معافی، خیر خواہی، شفقت اور مہربانی کی بارش برسانی تھی۔ اس کے برعکس آج کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ انسان کے اوپر نفرت اور غصہ اور اشتعال کا خون اُنڈیل رہے ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دور اول کے عمل کا یہ نتیجہ پیدا کیا تھا کہ تو میں کی قومیں اور قبیلے کے قبیلے اسلام کے سایہ میں داخل ہو گئے۔ اسلام ساری دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور اور ب سے زیادہ غالب دین بن گیا۔ اور موجودہ زمانہ میں اسلام ساری دنیا میں پتھر ہو رہا ہے، وہ ایک بلین مسلمانوں کے باوجود ساری دنیا میں کمزور اور مغلوب مذہب بنا ہوا ہے۔

ہر آدمی کے اندر پیدائش طور پر دو مختلف صلاحیتیں ہیں۔ ایک نفس لوامہ (صغیر، اور دوسرے، نفس امارہ (انانیت)۔ یہ دونوں صلاحیتیں ابتدائی طور پر سوئی ہوئی حالت میں ہوتی ہیں۔ اب اگر آپ فریق ثانی کے نفس لوامہ کو جگانیں تو اس کی شخصیت کا انسانی جزر آپ کے حصہ میں آئے گا۔ اور اگر آپ فریق ثانی کے نفس امارہ کو جگانیں تو اس کی شخصیت کا حیوانی جزر آپ کے حصہ میں آئے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ آپ آدمی کے وجود کے انسانی حصہ کو جگانیں۔ اس لیے آپ نہ صرف اچھوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے بلکہ بروں کے ساتھ بھی آپ ہمیشہ اچھا سلوک کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے آدمی کی چھپی ہوئی فطرت جاگتی تھی۔ اور آخر کار وہ اسلام قبول کر کے آپ کا ساتھی بن جاتا تھا۔

موجودہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل نہیں کرتے کہ بروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ وہ ہمیشہ رد عمل کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا طریقہ صرف فریق ثانی کی انانیت کو جگانے کا باعث بنتا ہے۔ خدا کے بندوں کے لیے ان کے پاس محبت کا پانی نہیں۔ البتہ ان کے پاس نفرت کا خون کافی مقدار میں موجود ہے۔ جس کو وہ لوگوں کے اوپر اندھے رستے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خدا کے س باغ میں صرف کانٹے ملیں گے۔ وہ اس باغ کے پھولوں کے مالک نہیں بن سکتے۔ یہی ت اؤن قدرت کا فیصلہ ہے۔

## تشخص کا مسئلہ

مولانا عبد الستین بنارس (مقیم دہلی) نے ۱۰ نومبر ۱۹۸۹ء کی ملاقات میں ایک واقعہ بتایا۔ وہ دہلی سے بنارس کے لیے سفر کر رہے تھے۔ ٹرین میں ان کی ملاقات ایک ہندو مسافر سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے مذکورہ ہندو سے پوچھا کہ دسہرہ کیا ہے۔ ہندو نے فوراً جواب دیا: جیسے آپ کے یہاں تمزیہ ہے ویسے ہی ہمارے یہاں دسہرہ ہے۔

ایک اور مسلمان بزرگ نے بتایا کہ انھوں نے ایک ہندو لیڈر کی تقریر سنی۔ لیڈر نے تقریر کے دوران کہا کہ مجھے تو مسلمان اور ہندو کا کوئی فرق نہیں معلوم۔ بس اتنا ہے کہ مسلمان رٹاکر پوجتے ہیں اور ہندو کھڑاکر پوجتے ہیں (یعنی مسلمان قبر کے مردہ کو پوجتے ہیں اور ہندو مندر کی مورتی کو) ایک بار ایک شہر میں عید میلاد النبی کا جشن تھا۔ روایتی انداز میں لمبا جلوس نکالا گیا۔ ایک ہندو نے اس کو دیکھ کر کہا: آخر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کیا فرق ہے۔ ہندوؤں کے یہاں اگر رام ایسا ہے تو مسلمانوں کے یہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

ایک مسجد میں روزانہ فجر کی نماز کے بعد لاڈ اسپیکر پر ”درود و سلام“ پڑھا جاتا تھا، انت خرافی ہوتی تھی۔ پڑوس کے ایک ہندو نے چند روز اس کو سنے کے بعد کہا: ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہب تو محمد کو ایک ہی دکھائی دیتا ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ ہندوؤں کے یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کا نام کیرتن ہے، اور مسلمانوں کے یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کا نام انھوں نے درود و سلام رکھا ہے۔

اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ موجودہ مسلمانوں نے اپنے دین میں اتنی بدعات اور تحریفیات کی ہیں کہ اب دوسرے مذہب والوں کی نظر میں اسلام اور غیر اسلام کا فرق ہی مٹ گیا ہے۔ اسلامی تشخص کا سب سے بڑا مسئلہ بلاشبہ یہی ہے۔ نام ہنسا د مسلم رہنا شہور کرتے ہیں کہ غیر مسلم تو ہیں ہمارے اسلامی تشخص کو مٹانا چاہتی ہیں۔ مگر اسلامی تشخص کو مٹانے کا جو واقعہ خود مسلمان انجام دے رہے ہیں، اس کے خلاف وہ کچھ نہیں بولتے۔ شاید اس لیے کہ دوسری قوم کے خلاف بولنا سب سے زیادہ آسان کام ہے اور اپنی قوم کے خلاف بولنا سب سے زیادہ مشکل کام۔

## اسلوب دعوت کا مسئلہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے اپنی پیغمبرانہ زندگی کے تقریباً تیرہ سال مکہ میں گزارے۔ یہ آپ کی زندگی کا خالص دعوتی مرحلہ تھا۔ اس ابتدائی مرحلہ کی تفصیل بتائے ہوئے ابن اسحاق کہتے ہیں:

فلما بآدى رسول الله صلى الله عليه وسلم قومه بالاسلام وصدح به كما امره الله لم يبعد منه قومه ولم يردوا عليه، حتى ذكر آلهتهم وهايعا، فلما فعل ذلك اعظموه وناكروه وحبموا خلائقته وعداوته  
(سيرة ابن هشام، الجزء الاول، صفحہ ۶۶-۶۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی قوم کے سامنے اسلام کا اظہار کیا اور کلمہ کھڑا اس کا اعلان فرمایا جیسا کہ اللہ نے آپ کو حکم دیا تھا، تو آپ کی قوم نے آپ سے دوری اختیار نہ کی اور نہ آپ کا رد کیا۔ یہاں تک کہ آپ نے ان کے معبودوں کا ذکر کیا اور ان پر عیب لگایا۔ تو جب آپ نے ایسا کیا تو انہوں نے آپ کو اہمیت دی اور اس کا انکار کیا اور آپ کی مخالفت اور دشمنی پر متحد ہو گئے۔

اس بیان میں "عیب" سے مراد وہی چیز ہے جس کو آج کل تنقید کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی تین سال تک سادہ اور غیر تنقیدی انداز میں قریش کے سامنے اپنی بات رکھی۔ اس کے بعد آپ نے تنقیدی انداز اختیار فرمایا۔ ابتدائی مرحلہ میں آپ کے مخالفین نے کوئی براہمی نفاہ نہیں کی۔ مگر جب آپ نے ان کے معبودوں کے الفاظ دیگر اکابر قوم پر تنقید کی تو وہ خست برہم اور مشتعل ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر مستقل طور پر غیر تنقیدی انداز میں کلام کرتے رہتے اور مشرکین میں بھی تنقیدی آیتیں ذاتر تیس تو عرب کے لوگ وہ مخالفت اور دشمنی اختیار نہ کرتے جو انہوں نے بعد کو اختیار کی۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی تمام مسلمات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے تنقیدی اسلوب پر قائم رہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر تنقیدی نوعیت کا روحانی اور اخلاقی انداز ذاتی مقبولیت یا عوامی بیخبر جمع کرنے کے لیے تو بہت کارآمد ہے، مگر وہ اصل مقصد کے لیے کارآمد نہیں۔ غیر تنقیدی انداز لوگوں کو سننے میں بہت اچھا لگتا ہے، مگر وہ ذہنوں میں لمچیل پیدا نہیں کرتا۔ اس سے وہ منکری انقلاب نہیں آتا، جب کہ آدمی کی سوچنے کی صلاحیت جاگتی ہے۔ اس پر ایک چیز کا غلط ہونا منکشت ہوتا ہے اور دوسری چیز کے صحیح ہونے کو وہ شعوری طور پر دریافت کرتا ہے۔ اسلام کو وہ افراد مطلوب ہیں جو انقلابی (کڑا نیکاری) ذہن رکھتے ہوں، اور تنقیدی انداز دعوت کے بغیر ایسے افراد کا بنا ہرگز ممکن نہیں۔

غیر تنقیدی اسلوب غیر فطری اسلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح بھی صحیح ہے اور غلط بھی صحیح۔ یہی وجہ ہے کہ جو تحریک غیر تنقیدی انداز میں چلائی جائے، اس سے مصنوعی شخصیت پیدا ہوتی ہے، اس کے ذریعہ کبھی مطلوب اسلامی شخصیت پیدا نہیں کی جاسکتی۔

رات کے وقت تالاب میں شبنم گرتی ہے۔ مگر اس سے تالاب کے پانی میں کوئی تہوج پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اسی تالاب میں ایک بڑا پتھر پھینک دیجئے تو اس سے کٹھڑے ہوئے پانی میں زبردست تہوج پیدا ہو جائے گا۔ اس مثال سے تنقیدی اور غیر تنقیدی اسلوب کے فرق کو سمجھا جاسکتا ہے۔ غیر تنقیدی اسلوب شبنم کی مانند ہے۔ اس سے آدمی کو ایک روحانی سکون تو ملتا ہے مگر اس سے اس کے سینہ میں اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔

مگر یہ مطلوب اسلامی شخصیت نہیں۔ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایمان امید اور خوف کے درمیان ہے (الایمان بین الرجاء والخوف) مومن کو ایک طرف امید ہوتی ہے کہ خدا رحیم و کریم ہے، وہ اس کو بخش دے گا۔ دوسری طرف اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ خدا عادل ہے، وہ اس سے حساب لے گا، اور جس کا حساب لیا گیا وہ ہلاک ہوا (من فوقش فقد هلك) اس بنا پر مومن ہمیشہ "نفسی نفعی" کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ چیز اس کو ایک پر اضطراب شخصیت بنا دیتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام اصحاب رسول ہمیشہ اضطراب کی نفسیات میں رہتے تھے۔ ان میں سے کوئی شخص بھی پرسکون شخصیت کا حامل نہ تھا۔

ایمان موجودہ دنیا میں درد ہے اور آخرت میں راحت۔

## جنگ بے فائدہ

یونین ۲۳ سال تک یورپی ملکوں سے جنگ لڑتا رہا۔ آخر کار انگلیس کے ڈیوک

(Duke of Wellington) نے ۱۸ جون ۱۸۱۵ کو وائٹر لو جنگ (Battle of Waterloo)

میں یونین بوناپارٹ کو شکست دی (X/570) ڈیوک کی یہ فتح اتنی عظیم تھی کہ اس کو "گریٹ ڈیوک" کہا جانے لگا۔ اس کی بابت لکھا گیا کہ وائٹر لو کے مقام پر یونین کو شکست دینے کے بعد وہ دنیا کے فاتح کو فتح کرنے والا بن گیا:

By defeating Napoleon at Waterloo he became the conqueror of the world's conqueror. (19/755)

ہر طرف ڈیوک کی تعریف کی جاتے لگی۔ مسگر خود ڈیوک جھوٹے فخر (false pride) کا شکار

نہیں ہوا۔ اس کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس فتح تک پہنچنے کے لئے اس کے اپنے ملک سمیت چار ملک تباہ ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ کوئی بھی چیز، ایک بار ہی ہوئی جنگ کے سوا، ایک جیتی ہوئی جنگ کی غم نائی کی آدھی غم ناک بھی نہیں ہو سکتی:

Nothing except a battle lost can be half so melancholy as a battle won.

یہی ہر جنگ کا معاملہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ میں بارحیثیت کے درمیان اتنی ہی فرق ہے کہ ہار کے ساتھ شرمندگی شامل ہوتی ہے، اور حیثیت کے ساتھ شرمندگی شامل نہیں ہوتی۔ ورنہ ہر ہارمی کے اعتبار سے جیت اور ہار دونوں تقریباً یکساں ہیں۔

دوسری عالمی جنگ میں برطانیہ فاتح بن کر نکلا۔ مگر اس کے نتیجے میں وہ اتنا کمزور ہو گیا کہ اس کے اندر یہ طاقت نہیں رہی کہ وہ اپنے زیر قبضہ ملکوں پر اپنا کنٹرول قائم رکھ سکے۔ فیج کی جنگ میں امریکہ نے بظاہر شاندار فتح حاصل کی۔ مگر مسلسل ایسی رپورٹیں اخباروں میں آرہی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ کے لوگ نتیجہ جنگ کے معاملہ میں مایوسی کا شکار ہو رہے ہیں۔

ہندستان حماس (۸ جون ۱۹۹۱) میں اس کے نمائندہ مقیم دانشمندان، سٹرائیپ سی من کی رپورٹ

جیسی ہے۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ امریکہ کے لوگ جنگ کے نتائج پر مطمئن نہیں۔ وہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ امریکہ نے آخری جنگ کی جنگ سے کیا حاصل کیا:

Just what did the United States gain from the war?

جب کسی سے اختلاف اور ٹکراؤ کی حالت پیش آتی ہے تو اس کا پر امن حل بھی وہیں موجود ہوتا ہے۔ مگر آدمی اکثر اوقات پر امن حل کو چھوڑ کر جنگ کے حل کی طرف دوڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ پر امن حل میں وہ اپنی کچھ چیزوں کو کھو رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ پر امن حل بالظاہر جو نقصان ہے، اس سے بہت زیادہ نقصان دہ ہے جو جنگ کی صورت میں آدمی کو برداشت دینا پڑتا ہے۔

مثال کے طور پر سیلچ کے بحران میں اگر کویت اس پر راضی ہو جاتا کہ وہ اپنا غیر آباد جزیرہ واربہ (Warba Island) عراق کو پیش کر دے، جیسا کہ عراق کا مطالبہ تھا، تو یہ اس نقصان سے بہت کم مارجن جنگ کی صورت میں کویت کو اٹھانا پڑا۔ اسی طرح خود عراق کو کویتی جزیرہ کے بارہ میں اپنے مطالبے باز آجاتا اور اپنی موجودہ جغرافیائی حالت پر قانع رہتا تو یہ اس کے لئے اس نقصان سے ہزاروں گنا کم ہوتا جو جنگ کے بعد اس کے نتیجہ میں عراق کے حصہ میں آیا۔

انسان جب بھی کسی جنگ میں الجھتا ہے تو وہ جذباتی ہیجان کی حالت میں اس سے الجھتا ہے۔ اگر ماں ایسا کرے کہ ٹکراؤ پیش آنے کی صورت میں وہ رک کر ٹھنڈے دن سے غور کرے تو یقینی طور پر وہ منہ کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دے گا۔

جنگ کی طاقت، ہتھیار ہے۔ مگر جس طرح فوج اور ہتھیار ایک طاقت ہے، اسی طرح امن کی تعمیری طاقت ہے۔ جس طرح ہتھیار دشمن کو زیر کر سکتا ہے، اسی طرح امن کی طاقت بھی دشمن کو زیر کرتی ہے۔ البتہ دونوں میں یہ فرق ہے کہ ہتھیار کو استعمال کرنا ہمیشہ تخریب کی قیمت پر ہوتا ہے۔ امن کی طاقت ایک تعمیری طاقت ہے۔ وہ اپنے آخری استعمال کے بعد بھی تعمیر ہی رہتی ہے۔ جنگ ریکونسٹرکشن کرنے سے نئے شدید تر مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب کہ پر امن تدبیر مسئلہ کو اس طرح حل کرتی ہے کہ وہ کوئی نیا مسئلہ پیدا ہونے نہیں دیتی۔

## بے ترتیب نماز

ایک شخص اگر ایسا کرے کہ وہ نماز پہلے پڑھے اور وضو اس کے بعد کرے تو ایسے آدمی کو نماز پڑھنے والا نہیں کہا جائے گا۔ شریعت کی نظر میں وہ ایک سرکش آدمی ہے نہ کہ نمازی آدمی۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی بے ترتیب نماز پڑھے تو اگرچہ وہ بغلام نماز کے تمام اجزاء کو دہرا رہا ہو گا مگر اس کی بے ترتیبی اس کی نماز کو باطل کر دے گی۔ کوئی بھی عالم یا فقیہ اس کو نمازی تسلیم نہیں کرے گا۔

دنیا میں آپ کو ایسا کوئی مسلمان نہیں ملے گا جو اس قسم کی بے ترتیب نماز پڑھے۔ کیوں کہ وہ نماز کے معاملہ میں اس مسئلہ کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ ایسی بے ترتیب نماز خدا کے یہاں قبول ہونے والی نہیں۔ مگر ایک اور معاملہ میں ہر جگہ کے مسلمان اس قسم کی "نماز" پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ جہتے ہیں کہ یہ "نماز" پڑھ لیں۔ اور اس کے بعد وضو کریں۔ اس تبدیلی یا تجزیہ کے باوجود ان کو مجاہد اسلام کا خطاب مل رہا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعلان کے مطابق، اسلامی حکومت یا اسلامی نظام قائم کرنے کا نعرہ لگ رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے آپ نے لمبی مدت تک رات دن محنت کر کے لوگوں کا ذہن بنایا۔ اس کے بعد اسلامی قانون کا نفاذ کیا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مجاہدین اسلام اس کے برعکس یہ چاہتے ہیں کہ پہلے حکومت پر قبضہ کریں، اس کے بعد افراد کا ذہن بنائیں۔

ان کا کہنا ہے کہ پہلے ملک حاصل کرو، اس کے بعد اسلامی زندگی کی تعمیر کرو۔ پہلے فاسد حکمراں کو ہٹا کر دو، اس کے بعد صحت کی قیادت پیدا کرو۔ پہلے سینما ہاؤس کی عمارت کو توڑ دو، اس کے بعد سینما سنی کا خاتمہ کرو۔ پہلے سیاسی تبدیلی آؤ، اس کے بعد افراد کا ذہن بدلو۔ پہلے وزارت اعلام پر قبضہ کرو، اس کے بعد وسائل اعلام کو اسلام کے لیے استعمال کرو۔

اس قسم کی تمام کارروائیاں پہلے نماز اور اس کے بعد وضو کی مصداق ہیں۔ معروف نماز کی ترتیب چونکہ تسلسل کے ساتھ زمانہ نبوت سے چلی آرہی ہے، اس لیے تسلسل اور تواتر نے اس کی ہیئت کو لوگوں کی نظر میں اہل بنا دیا ہے۔ وہ اس کے خلاف سوچنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اس کے برعکس، سدوم حکومت کے قیام کے بارے میں اس قسم کا عملی تواتر یا تسلسل مشاہدہ موجود نہیں۔ اس لیے اس کی ترتیب کا معاملہ لوگوں کو

طرح ان نظر نہیں آتا جیسا کہ نماز کا نظر آتا ہے۔ حلال کشہ یعنی حکم یا سنت رسول ہونے کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

”پہلے اقتدار اور اس کے بعد ذہن سازی“ کا نظریہ اگر صحیح ہوتا تو خدا کے تمام پیغمبر سب سے پہلے اس نظریہ پر عمل کرتے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ مواقع طے کے باوجود انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے لوگوں کی طرف سے یہ پیش کش کی گئی کہ اگر آپ اپنی اس دعوت کے ذریعہ حکومت کے طالب ہیں تو ہم آپ کو اپنے اوپر حاکم بنا دیتے ہیں، وان کنت ترید بدمنا ملکنا ملکناک علینا۔ سیرۃ ابن ہشام، ابجزء الاول، صفحہ ۳۱۵) مگر آپ نے حکومت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ اقتدار سے الگ رہ کر توحید اور آخرت کے عقیدہ کو لوگوں کے دلوں میں داخل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہی واقعہ ایک اور شکل میں پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مصر میں مبعوث کیا۔ وہاں آپ نے فرعون کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی۔ بے عرصہ تک آپ جدوجہد کرتے رہے۔ مگر فرعون نے آپ کی دعوت قبول نہ کی۔ یہاں تک کہ اللہ کی نظریں وہ قابل سزا ٹھہرا۔ اس کے بعد فرعون اور اس کا پورا لشکر سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ فرعون کی فوجی طاقت مکمل طور پر ختم ہو گئی۔

اب حضرت موسیٰ کے لیے موقع سنکا کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ لوٹ آئیں اور مصر کے خالی تخت پر بیٹھ جائیں۔ وہ مصر کے شاہی محل اور اس کے ایوان حکومت پر قبضہ کریں۔ اس طرح اقتدار حاصل کر لینے کے بعد وہ مصر کے لوگوں کا باپ بنیں۔ اسرائیل کا ذہن بدلنے کا کام کریں۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا۔ مصر میں سیاسی قبضہ کے مواقع ہونے کے باوجود وہ مصر کو چھوڑ کر صحرائے سینا میں چلے گئے۔ اور وہاں دعوتی انداز میں بنی اسرائیل کی اصلاح و تربیت کا کام کرتے رہے۔ تربیت کا یہ کام جب ۴۰ سال میں مکمل ہو گیا، اس وقت بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں سیاسی اور فوجی اقدام کیا، اور غنائم کو مغلوب کر کے شام و فلسطین پر اپنی حکومت قائم کی۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسی چیزوں کی ایجاد نے ہمارے لیے نئے مواقع پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ ذہن سازی کے نہایت وسیع اور کارآمد ذرائع ہیں۔ مگر ان کو استعمال کرنے کے لیے اقتدار کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے آج کی ضرورت یہ ہے کہ پہلے اقتدار پر قبضہ کر لیا جائے، اس کے بعد نیوز میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کو استعمال کر کے عوام کی ذہنی تربیت کی جائے۔ اس طرح خود ذہن سازی

کے کام کا تقاضا ہے کہ پہلے اقدار پر قبضہ حاصل کیا جائے تاکہ تربیت عوام کے اس موثر ذریعہ کو اسلام کے حق میں استعمال کیا جاسکے۔

مگر یہ محض خوبصورت الفاظ ہیں۔ اس کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ واقف یہ ہے کہ جس طرح وضو اور نماز کی ترتیب ابدی ہے اسی طرح ذہنی انقلاب اور حکومتی انقلاب کی ترتیب بھی ابدی ہے۔ دور اول میں جس طرح انقلاب لایا گیا، بعد کے دور میں بھی اگر انقلاب لایا جاسکتا ہے تو اسی طرح لایا جاسکتا ہے۔ اس کے سوا دوسرا طریقہ وقت کا ضیاع ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

تجربات اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مثال کے طور پر جنرل محمد ضیا راجھی نے ۱۹۷۷ء میں پاکستان کے اقدار پر قبضہ کر لیا۔ اور ساڑھے گیارہ سال کی عسکریت تک پاکستان کے مصلحت مندان بنے رہے۔ پاکستان کے اقدار پر قابض ہونے کے بعد، دوسری بہت سی کارروائیوں کے علاوہ انہوں نے یہ کیا کہ ایک اسلام پسند لیڈر، محمود اعظم من روقی کو اطلاعات و نشریات کے محکمہ کا وزیر بنا دیا۔

اس کے بعد وہ ہم پوری طرح بے بسی گردی گئی جس کو میڈیا کے ذریعہ عوام کی ذہنی تربیت کہا جاتا ہے۔ مگر عوام کو شش کے باوجود اس کا ایک فی صد فائدہ بھی حاصل نہیں ہوا۔ پاکستان کا معاشرہ مزید بگڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ضیا راجھی صاحب کی موت کے بعد پاکستان کا جو سپر لکشن، نومبر ۱۹۸۸ء ہوا، اس میں پاکستان کے عوام نے سردمی نظام کے حامیوں کو چھوڑ کر ان لوگوں کو مرکزی اقتدار پر چھڑایا جو بالآخر عوام پر سیکورٹری نظام کے حامی تھے۔

## داعی کا مقام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے ساتھ سخت ترین واقعات پیش آئے۔ وقت کی جابر سلطنت کے مقابلہ میں وہ بالکل بے یار و مددگار ہو گئے۔ پھر بھی اللہ نے معجزاتی طور پر ان کو بچا لیا۔ مصر سے نکل کر وہ ایک ایسے غیر آباد علاقہ میں پہنچے جہاں خشک بیابان اور جھیل پہاڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مگر اللہ نے چٹانوں کے اندر سے ان کے لئے پانی کے چشمے جاری کر دیئے اور ان کی غذا کے لئے اوپر سے من و سلویٰ نازل فرمایا۔

بنی اسرائیل کے ساتھ اللہ کا یہ معاملہ قرآن میں محض ایک قصہ کے طور پر بیان نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس میں بہت بڑا سبق ہے۔ یہ تاریخ کی زبان میں داعی کے مقام کو بتایا گیا ہے۔ اللہ کے پیغام کا علم بردار بننے کے لئے آدمی کو اللہ کی سطح پر جینا پڑتا ہے۔ اس کو اپنے آپ کو عالم آخرت سے اتنا زیادہ متعلق کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ دنیا کے سب سے اس کے ہاتھ سے چھوٹے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ داعی وہی شخص بن سکتا ہے جو اپنے آپ کو اتنا زیادہ غیر اللہ سے کاٹے اور اللہ کے ساتھ اپنے کو اتنا زیادہ جوڑے کہ اس کی ہستی تمام تر اللہ رب العالمین کے اوپر تر بھیر ہو جائے۔ وہ عجز کے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں خدا کی نصرت ہی اس کے لئے واحد سہارا ہو۔ اس کا شعور احتیاج اتنا کامل ہو جائے کہ پانی کا گھونٹ اس کو خدا کی طرف سے آرا ہو گھونٹ معلوم ہونے لگے، کھانے کا ہر لقمہ جو وہ اپنی خلق سے اتارے، اس کو محسوس ہو کہ یہ بلاہ راستہ اس کے پاس خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ عبودیت کے اس کامل شعور کی سطح پر آدمی کی زبان سے جو کلمات نکلتے ہیں، اسی کا نام دعوت ہے۔ اس کے بغیر تو بھیا یا بولا جائے وہ تصنیف اور تقریر ہے نہ کہ اللہ کے پیغام کی پیغام رسانی۔

ایک راہ گیر نے دیکھا کہ ریلوے کا پل ٹوٹ گیا ہے۔ اس میں اس کو ایک اکسپرس ٹرین غوفانی رفتار کے ساتھ آتی ہوئی نظر آئی۔ اس وقت سیکڑوں مسافروں سے لدی ہوئی ٹرین کو بچانے کی ایک ہی صورت تھی: وہ اپنے خون سے اپنے کپڑے کو لال کرے اور اس کو لے کر ریلوے لائن پر کھڑا ہو جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ راہ گیر نے اپنے خون کی قیمت دے کر اپنے آپ کو وہاں پہنچا دیا جہاں اسکا ٹی ٹرین پر دوسرے مسافر بیٹھے والے تھے۔ اس کے بعد ہی ممکن ہو سکا کہ وہ دوسرے مسافروں کو آنے والے خطہ سے آگاہ کرے۔ ایک شخص جو آگ میں جل رہا ہو وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ "آگ جلاتی ہے۔" وہ شخص جس پر جلنے کا تجربہ نہیں گزرا، اس کے لئے "آگ جلاتی ہے" کا جملہ محض دور کا ایک جملہ ہے، وہ آگ کے جلانے کی خبر نہیں ہے۔ داعی اگر اپنے ذہنی امکانات کو بچانے کی خاطر زمانہ سازی کرے، وہ اپنے ذہنی نقصانات کی خاطر لوگوں سے لڑے، وہ عوامی مقبولیت کو باقی رکھنے کے لئے ان کی پسندیدہ بولی بولنے لگے۔ وہ بربادی کے اندیشہ کی بنا پر مصالحت پرستی کا طریقہ اختیار کرے۔ تو یہ اس کے ذہن کی نفی کے ہم معنی ہو گا۔ اس طرف وہ اپنے ظاہری فائدوں کو محفوظ کر لے گا۔ مگر اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ دانیانہ تجربات سے محروم ہو جائے گا۔ وہ زبان سے آخرت کی بات کرے گا مگر عملاً دنیا میں جی رہا ہو گا۔ وہ لفظی طور پر اپنے آپ کو خدا کا داعی ظاہر کرے گا مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کا پورا وجود غیر اللہ میں اٹکا ہوا ہو گا۔ وہ تحریر و تقریر میں حتیٰ پرستی کی نمائندگی کرے گا مگر اپنی ذمہ داری کی زندگی میں وہ خود پسند ہو گا۔

اور مفاد پرستی کو اپنا مذہب بنائے ہوئے ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی بربادی کی قیمت پر ہی آخرت کی آبادی کا پیغام دیا جاسکتا ہے۔ جو اپنے آپ کو دنیا کی بربادی سے بچائے، وہ گویا اپنے آپ کو مقام دعوت تک پہنچنے سے بچا رہا ہے۔ ایسے شخص کا دعوتی تقریر کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص رات دن دنیا کو سینٹھیں میں لگا ہوا ہوا اور دوسرے سے کہے کہ زہد اور قناعت کا طریقہ اختیار کرو۔

کسی بندہ خدا کی زبان سے حق کی آواز کا اٹھنا دعوت کے اعتبار سے اس کے اوپر خدا کی رحمت کا اتمام ہے۔ اور داعی کے اعتبار سے اس کو دعوت حق کا کرڈٹ دینا ہے۔ بندوں کی نظر میں کوئی دعوت اسی وقت دعوت ہے جب کہ وہ شاعری اور تفریح کی سطح پر نہ رہی جا رہی ہو بلکہ حقیقی زندگی کی سطح پر کسی روح سے ابلی ہو۔ اسی طرح کوئی بندہ اللہ کی نظر میں اسی وقت دعوتی شرف کا مستحق بنتا ہے جب کہ وہ اللہ کا ہم نوحیت بن کر دعوت خداوندی کے لئے اٹھا ہو۔ اس کے بغیر بندوں کی نظر میں اس کی کوئی قیمت ہے اور نہ اللہ کی نظر میں۔

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من احبّ دنیاہ اصغرّ بآخرتہ ومن احبّ  
 آخرتہ اصغرّ بدنیہا فاشروا ما یبغی علی ما یبغی  
 جو اپنی دنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کو کھودے گا اور  
 جو اپنی آخرت سے محبت کرے گا وہ اپنی دنیا کو کھودے گا پس جو  
 باقی رہنے والا ہے اس کو ترجیح دو اس پر جو فنا ہونے والا ہے۔  
 (مسند احمد، سبقی)

جب آدمی دنیا میں آرام اور عزت سمیٹنا چاہتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخرت کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص کو آخرت کی فکر لگتی ہے تو بائبل قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ دنیا کی چیزوں کے لئے اس کی فکر کم ہو جاتی ہے اور نتیجہً اس کو دنیا کے معاملہ میں نقصان پر قابغ ہونا پڑتا ہے۔

یہی واقعہ داعی کے معاملہ میں مزید شدت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ایک شخص جو ذاتی طور پر مومن و مسلم بننا چاہے، اس کے مقابلہ میں اس کی ذمہ داریاں کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی ہیں جو دوسروں کو ایمان و اسلام کی دعوت پہنچانا چاہتا ہو۔ عام آدمی اگر مومن ہے تو داعی کو شہر بننا پڑتا ہے۔ دوسرے لوگ جس چیز پر بہت ایمان لائے ہوئے ہیں، داعی کے لئے نہ درسی ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو دیکھے، تاکہ دیکھی ہوئی چیز کی طرح وہ دوسروں کو اس کی بابت خبردار کر سکے۔

غیر حقیقتوں کو اس دنیا میں نہ بہت تصور کی نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لئے یہ دیکھنا اس وقت و تواریخ میں آتا ہے جب کہ نظر آنے والی چیزوں سے وہ اپنی توجہ کو اتنا زیادہ ہٹائے کہ اس کی تمام توجہات عالم آخرت کی طرف لگ جائیں۔ آخرت کو دیکھنا صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی دنیا کو نہ دیکھے پورا ماضی ہو جائے۔ دنیا کو کھونے والا ہی آخرت کو پاتا ہے اور جو شخص دنیا میں بے توجہ ہو جائے وہی وہ شخص بنتا ہے جو آخرت کو دیکھے اور دوسروں کو اسے دکھائے جس کی نگاہیں دنیا میں اٹکی ہوئی ہوں، وہ کبھی آخرت کو دیکھنے والا نہیں بن سکتا۔ اس لئے وہ کبھی داعی کے مقام پر پہنچ کر نہیں ہو سکتا۔ دعوت آخرت کی واحد قیمت بربادی دنیا ہے۔ جو اپنی دنیا کو برباد کرنے کے لئے تیار نہ ہو اس کو آخرت کی دعوت کے میدان میں قدم بھی نہیں رکھنا چاہئے۔

”آپ ہم کو اسلام کی طرف بلاتے ہیں“ ایک غیر مسلم نے کہا ”مگر اسلام وہی تو ہے جس نے موجودہ ایران میں مسلمانوں کو لڑا رکھا ہے۔ پاکستان میں اسی اسلام کے نام پر مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں اور ان کی لڑائی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ کیا اسی آپسی لڑائی والے دین کو اب آپ ہمارے ملک میں بھی داخل کرنا چاہتے ہیں“

غیر مسلم بھائی کی اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مجھے ”ٹیرھی کھیر“ کا لطیف یاد آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک نابینا کو ایک شخص نے کھانے کی دعوت دی ”آپ کیا کھلائیں گے“ نابینا نے پوچھا۔

”کھیر کھلاؤں گا“

”کھیر کیا چیز ہوتی ہے“ نابینا نے دوبارہ سوال کیا۔

”کھیر سفید ہوتی ہے“

”کیسی سفید“

”جیسے بگلا“

”بگلا کیسا ہوتا ہے۔ میں نے تو اس کو بھی نہیں دیکھا“ اب دعوت دینے والے نے اپنے ہاتھ کو بگلا کی شکل کا بنا کر نابینا کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ بگلا ایسا ہوتا ہے۔ نابینا نے ٹول کر دیکھا تو وہ اس کو ایک ٹیرھی سی چیز معلوم ہوئی۔ اس نے سمجھا کہ کھیر کوئی ٹیرھی میٹھی چیز ہوتی ہے۔ اس نے سوچا کہ ایسی ٹیرھی چیز اگر میں نے کھائی تو کہیں وہ میرے گلے نہ چسب جائے۔ اس نے کہا: بھائی! مجھے ایسی ٹیرھی کھیر سے معاف رکھو۔ میں تمہاری دعوت نہیں کھاؤں گا۔“

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے بھی دین اسلام کو ایسا ہی ٹیرھا دین بنا رکھا ہے۔ اسلام کے نام پر طرح طرح کے مذہبی، سیاسی اور معاشی جھگڑے برپا ہیں۔ اسلام دین رحمت تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں اس کو دین منازعت بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ”ٹیرھا دین“ ہر ایک لیے پھرتا ہے۔ مگر سیدھا سچا دین کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اسلام کے یہ نادان دوست اگر اسلام کا نام لینا چھوڑ دیں تو وہ زیادہ بہتر طور پر اسلام کی خدمت کریں گے۔ یہی نہیں، بلکہ مسلمانوں نے اپنے عمل سے اسلام کو دوسروں کی نظر میں حقارت کا موضوع بنا دیا ہے، بجائے اس کے کہ وہ عظمت کا موضوع بنے۔



آپ نے ان سے مسلمانوں جیسا معاملہ فرمایا اور ان کے ظاہر احوال پر انھیں باقی رکھا۔  
 مسلم، احمد، ابن ماجہ اور ابو داؤد نے اسامہ بن زید سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک سریہ میں بھیجا۔ ہم صبح کو ہمدین کے علاقہ میں پہنچے۔ وہاں میں نے  
 ایک آدمی کو پکڑا۔ اس نے فوراً اللہ پڑھا۔ پھر بھی میں نے اس کو نیزہ مار دیا۔ اس کے بعد میرے دل  
 میں مشہد پیدا ہوا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: کیا اس  
 نے لا الہ الا اللہ کہا پھر بھی تم نے اس کو قتل کر دیا (قال لا الہ الا اللہ وقتلتمہ) میں نے کہا اے رسول اللہ  
 اس نے ہتھیار کے ڈر سے کہا تھا۔ آپ نے فرمایا: پھر کیوں نہ تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تاکہ تم کو  
 معلوم ہو کہ اس نے واقعہ کہا ہے یا نہیں کہا ہے (افلا شققت علی قلبہ حتی تعلم اقا لہا ام لا)  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جملہ کو برابر دہراتے رہے یہاں تک کہ میں نے تمنا کی کہ کاش میں آج  
 مسلمان ہوا ہوتا۔

حضرت عمر بن الخطاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھے عبد اللہ بن ابی  
 (رمیس المناقین) کے قتل کی اجازت دیجئے۔ مگر آپ نے ان کو اجازت نہیں دی۔ اسی طرح ابن ابی  
 کے لڑکے عبد اللہ نے ابن ابی کو قتل کرنے کی اجازت مانگی جب کہ غزوہ مریسج میں اس کا نفاق  
 ظاہر ہو چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ نے انکار فرمایا اور کہا: بلکہ ہم اس سے نرمی کا معاملہ کریں گے  
 اور اس سے اچھا تعلق رکھیں گے (بل نأمر بک وبہ ونحسن صحبتہ)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو منافق قرار دیکر اس کو قتل کرنا سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔  
 مخلص اور منافق کا تعلق اللہ سے ہے۔ وہی دونوں کو الگ کر کے ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ  
 دے گا۔ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم لوگوں سے ظاہری حالات کے مطابق معاملہ کریں۔  
 مدینہ کے منافقین یہود سے ملے ہوئے تھے وہ اسلام کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ وہ  
 بظاہر مسلمان مگر اندر سے نامسلمان تھے۔ اس کے باوجود ان کو قتل نہیں کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
 کو مدینہ میں اقدار حاصل تھا مگر آپ ان کی حقیقت جانتے ہوتے ان کو برداشت کرتے رہے یہاں  
 تک کہ منافقین اپنی طبعی موست مرکز اللہ کے یہاں حساب دینے کے لئے پہنچ گئے۔

## صبر اور دعوت

صبر دایگی کا اخلاق ہے۔ صبر ہی کے ذریعہ وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جب کہ کوئی شخص دعوتی مواقع کو استعمال کر سکے۔ جو آدمی ناخوش گوار باتوں پر صبر کرنے کے لیے تیار نہ ہو وہ اس دنیا میں کبھی دعائی کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

سر جیمز جینز مشہور انگریز سائنس دان ہے۔ اس نے طبیعیات اور فلسفہ (Physics & philosophy) کے نام سے ۱۹۴۱ میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کے دیباچہ میں اس نے اعتراف کیا کہ کائنات کے سائنسی مطالعہ نے ہم کو جہاں پہنچایا ہے اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کا دروازہ کھولنا ممکن ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کا ہینڈل حاصل کر سکیں :

It almost seems to suggest that the door may be unlocked, if only we could find the handle. (p. 216)

انگریز سائنس دان نے جس وقت یہ سطرین لکھی ہیں عین اس وقت ساری دنیا کے مسلمان انگریزوں کی سیاسی بالادستی پر بھرپور کوران کے خلاف خون آشام لڑائی میں مصروف تھے۔ وہ انگریز کو صرف ایک قابل نفرت دشمن کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ اگر وہ انگریز کی سیاسی بالادستی پر وقتی طور پر صبر کر لیتے تو اچانک انھیں دکھائی دیتا کہ انگریز قوم حقیقت کے دروازے کھولنے کے لیے جس ”ہینڈل“ کی تلاش کر رہی ہے وہ ہینڈل ان کے پاس قرآن کی صورت میں موجود ہے۔

اس واقفیت کی صورت میں انگریز کے بارے میں ان کی پوری نفسیات بدل جاتی۔ اب وہ انگریز کو اپنا مدعو سمجھنے لگے۔ انگریز کی ہلاکت چاہنے کے بجائے اس کی ہدایت چاہنے لگے۔ وہ انگریز کی اصلاح کے لیے دعا کرتے اور اس کے خیر خواہ بن کر اس سے یہ کہتے کہ حقیقت کی منزل تک پہنچنے کے لیے تم کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ تمہارے حسدانے پیشگی طور پر قرآن کی صورت میں تمہارے لیے بھیج دیا ہے۔

صبر و دعوت کی لازمی شرط ہے۔ جہاں صبر نہ ہو وہاں دعوت بھی یقینی طور پر نہیں ہوگی۔

## داعی اور مدعو

سڑک پر بروقت آدمی چلتے رہتے ہیں۔ مگر آنے جانے والوں میں کبھی " ملاقات " نہیں ہوتی کیونکہ ایک دوسرے سے نکل جاتا ہے اور دوسرا بائیں سے۔ جب کہ ملاقات کے لئے ضروری ہے کہ دونوں آدمی ایک رخ پر چل رہے ہوں۔

" دائیں بائیں " کا اصول سڑک کے لئے بہت کارآمد ہے مگر وہ ہر موقع کے لئے کارآمد نہیں۔ زندگی کے ایسے راستے بھی ہیں جہاں ملاپ درکار ہے نہ کہ ادھر ادھر سے کسرا کر نکل جانا۔ ان راستوں میں آپ کو بھی اسی رخ پر چلنا پڑے گا جس رخ پر دوسرا چل رہا ہے۔ ورنہ آپ ان راستوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دعوت کا راستہ ایسا ہی ایک راستہ ہے۔ یہاں اعراض کے بجائے ملاقات کا اصول اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ داعی اور مدعو کا سامنا ہی نہ ہوگا اور جب سامنا نہ ہوگا تو دعوت کس طرح پیش کی جائے گی اور وہ کس کے کان میں پڑے گی۔

مدعو اگر انٹرنیٹ زبان بولنے والا ہے تو آپ ہندی زبان بول کر اس کو اپنی دعوت سے باخبر نہیں کر سکتے۔ نہ درمی ہے کہ داعی بھی وہی زبان بولے جو مدعو کی زبان ہے۔ مدعو اگر ایک قومیت کا ہنگامہ کھڑا کئے ہوئے ہے تو آپ دوسری قومیت کا ہنگامہ کھڑا کر کے اس کو اپنے پیغام سے قریب نہیں کر سکتے۔ اس کے بجائے آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ قومیت سے بلند ہو کر ایسی اجتماعی اساس تلاش کریں جو دونوں کے درمیان مشترک ہو۔ مدعو اگر آپ سے روٹھ کر اپنا منہ پھیرے ہوئے ہے تو آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ اپنا منہ بھی دوسری طرف پھریں۔ اس کے بجائے آپ کو ایک طرف طور پر شکایات کو ختم کرنا ہوگا تاکہ دونوں کے درمیان وہ مندرل فصحا پیدا ہو جو کسی سنجیدہ پیغام کو سنانے کے لئے ضروری ہے۔

قومی مسلک میں جو چیز امت ہے وہ دعوتی مسلک میں زہر ہے۔ مفاد پرستانہ سیاست میں جو اصول زندگی کا پہلا گریب ہے وہ دعوت حق کی سیاست میں صفت اس قابل ہے کہ اس کو مکمل طور پر ترک کر دیا جائے۔ شخصی تیارات کے کاروبار میں جو چیز کامیابی کا زینہ ہے وہ دعوت کے عمل میں صفت ناکامی تک پہنچانے والا ہے۔ ایک طریقہ کو دوسرے طریقہ سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

داعی ہمیشہ مدعو کی رعایت کرتا ہے اور غیر داعی صحت اپنی رعایت کرنا جانتا ہے۔ داعی کو حق کا جھنڈا کھڑا کرنے کی فکر ہوتی ہے اور غیر داعی کو صرف اپنا جھنڈا کھڑا کرنے کی۔ داعی مدعو کا خیر خواہ ہوتا ہے اور غیر داعی صرف اپنا۔

## دعوتی مشن

ایک غیر مسلم ایک مولوی صاحب کے یہاں آیا اور یہ سوال کیا کہ اسلام کیا ہے۔ مولوی صاحب نے بہت اچھے انداز میں اس کے سامنے توحید اور آخرت اور مساوات بنی آدم کی تشریح کی۔ غیر مسلم حیب چلا گیا تو کچھ مسلمان جو وہاں بیٹھے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے، انہوں نے مولوی صاحب سے کہا: حضرت، ہم آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ ہم کو سیلا اور زیارت قبر جیسے مسائل کی تفصیل بتاتے ہیں۔ اور غیر مسلم نے آپ سے اسلام کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اس کو دوسری باتیں بتائیں۔ کیا ہمارا اسلام اور ہے اور ان کا اسلام اور۔ اس کے جواب میں مولوی صاحب نے کہا: ”اجی، یہ غیر مسلم ہمارے ان جھگڑوں کو کیا سمجھیں گے۔ ان کو تو اسلام کی بنیادی باتیں ہی بتائی جاسکتی ہیں۔“

مسلمانوں کو آج جہاں دیکھنے، آپس کے جھگڑوں میں مبتلا ہیں۔ شیعہ اور سنی کا جھگڑا، دیوبندی اور بریلوی کا جھگڑا، حنفی اور اہل حدیث کا جھگڑا۔ ایک جماعت اور دوسری جماعت کا جھگڑا۔ اور یہ سب کچھ عین اسلام کے نام پر ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھنے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اسلام ان کے نزدیک صرف آپس کے بحث اور جھگڑے کا نام ہے۔

مگر یہی مسلمان جو آپس میں مومن مسائل اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے جھگڑتے ہیں۔ انہیں کو اگر غیر مسلموں کے سامنے اسلام پیش کرنا ہو تو وہ سفیدہ اور حقیقت پسند بن جاتے ہیں۔ وہ جھگڑے والی باتوں کو حذف کرنے ان کے سامنے وہ اسلام پیش کرتے ہیں جو بنیادی ہے اور جس میں ایک فرقہ اور دوسرے فرقہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تمام موجودہ خرابیوں کا سبب یہ ہے کہ وہ دعوت اسلام اور شہادت علی اناس کے کام سے بٹ گئے ہیں۔ دوبارہ ان کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کو دعوت اسلام اور شہادت علی اناس کے کام پر لگایا جائے۔

دعوت عام کا کام عین اپنی فطرت کے اعتبار سے آدمی کو اسلام کی بنیادی باتوں کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ فردی چیزیں اپنے آپ حذف ہو جاتی ہیں جو اختلافات کا اصل سبب ہیں۔ غیر مسلموں میں خدا کے دین کو پہنچانے کا کام بیک وقت دعوتی ذمہ داری کی ادائیگی بھی ہے اور ان کے ساتھ مسلمانوں کے اختلافات کو ختم کرنے کی مؤثر ترین نماندہ ہیں۔

## دعوت یا نفرت

پرانی دہلی کے ایک محلہ میں ایک شخص نے دکان کھولی۔ اس کے بعد مملہ کا ایک آدمی اس کی دکان پر آنے لگا۔ وہ روزانہ آتا اور دوکان پر بیٹھ کر محلہ والوں کی برائیاں بیان کرتا۔ دکاندار نے پہلے نرمی کے ساتھ اس کو اس قسم کی باتوں سے روکنے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہ رکا۔ آخر دکاندار ایک روز ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا: میاں صاحب! بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ میری دکان پر نہ آئیں۔ آپ جن لوگوں کی برائیاں کرتے ہیں وہ سب میرے گاہک ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر اگر میرے دل میں ان کی نفرت آجائے تو میں ان کے ساتھ دکانداری نہیں کر سکتا۔ دکانداری پیسہ کا سودا ہے۔ وہ نفرت اور حقارت کا کاروبار نہیں۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلمان اسلام کے مسائل پر لکھنے اور بولنے کے چیمپین بنے ہوئے ہیں، اسلام بھی ان سے بزبان خاموش کہہ رہا ہے کہ آپ کا بہت کرم ہوگا، اگر آپ لوگ میرے بارہ میں لکھنے اور بولنے کا موجودہ کام ختم کر دیں۔ کیوں کہ آپ کا سارا کلام منفی کلام ہے، اور یہ منفی کلام میرے تمام دعوتی امکانات کو مسلسل طور پر برباد کر رہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے جو لکھنے اور بولنے والے ہیں، وہ سب کے سب اس سادہ حقیقت سے بے خبر نظر آتے ہیں جس کو مذکورہ واقعہ میں ایک معمولی دکاندار نے اول روز جان لیا تھا۔ ہمارے لکھنے اور بولنے والے دعوت کا نام لیتے ہیں۔ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپ کو داعی کہتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ ایسی باتیں لکھنے اور بولنے میں مشغول ہیں جو مسلمانوں کے اندر اپنی بدعوتوں کے خلاف نفرت اور بغض کی فصل اگانے والی ہوں۔

موجودہ مسلم دنیا میں جو لوگ لکھنے اور بولنے کا کام کر رہے ہیں، ان کے کلام کا شہرت کا خلاصہ ایک لفظ میں شکایت اور احتجاج ہے۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی غیر مسلم فرقہ یا گروہ کی برائیاں بیان کرنے میں لگا ہوا ہے۔ کوئی مغربی مشرقین کی سیاہ کاریوں کا اعلان کر رہا ہے اور کوئی صہیونی یہودیوں کی سیاہ کاری کا۔ کوئی استعماری طاقتوں کے ظلم کا انشاء کر رہا ہے اور کوئی ریلیس قوموں کی معاندانہ کارروائیوں کا۔ کوئی مسیحی مبلغین کی سازشوں کا انکشاف کر رہا ہے اور کوئی ہندو اجمار یہیستوں کے خفیہ منصوبوں کا۔

اسی طرح کوئی مسلم اقلیت کے خلاف غیر مسلم اکثریت کے امتیاز کے اعلا و شمار چھاپ رہا ہے۔ اور کوئی مسلمانوں کے فی تشخص کو ختم کرنے کے لیے اختیار کی معاندانہ کوششوں پر فریاد کرنے میں مشغول ہے۔ وغیرہ دعوت کی شریعت میں یہ تمام چیزیں ناجائز کے درجہ میں غلط ہیں۔ یہ تمام لوگ جن کے خلاف موجودہ قلمی اور سانی جہاد کیا جا رہا ہے، وہ وہی ہیں جن پر ہمیں دعوت کے فرض کو انجام دینا ہے۔ وہ سب کے سب ہمارے لیے مدعو کے درجہ میں ہیں۔ مذکورہ قسم کی تقریریں اور تحریریں مسلسل طور پر مسلمانوں کو اپنے مدعو کو وہ سے متنفر کر رہی ہیں۔ اور جن لوگوں کے خلاف آدمی کے دن میں نفرت پیدا ہو جائے، وہ ان کے اوپر دعوت کا عمل جاری نہیں کر سکتا۔

دعوت کا عمل محبت اور غیر خودی کے سرچشمے سے نکتے والا عمل ہے۔ وہ نفرت اور بغض سے بھرے ہوئے سینے سے ظاہر ہونے والا عمل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں داعی کو ایک طرف طور پر مہر اور اعتراض کی روشنی بوقتاً مٹ ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ دعوت اور مہر دونوں لازم اور ملزم ہیں۔ جو لوگ مدعو کی زیادتیوں پر مہر نہ کر سکیں، وہ خدا کے دین کو خدا کے بندوں تک پہنچانے کا کام بھی نہیں کر سکتے۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کے جو کھینے اور ہونے والے یہ کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی مدعو اقوام کے غلط اور ان کی سازشوں کے خلاف فریاد کرنے کی بیخسی لیے ہوئے ہیں، وہ درحقیقت شیطان کے ٹینٹ ہیں۔ شیطان چاہتا ہے کہ داش اور مدعو کے درمیان تلیفوں کو خوب بڑھائے تاکہ داعی اپنے مدعو سے اتنی متنفر ہو جائے کہ اس کے دن میں مدعو کے اوپر دعوتی عمل کرنے کا جذبہ ہی باقی نہ رہے۔ یہی وہ کار ہے جو آج ہر مسلمان کو کھینے اور ہونے والے انجام دے رہے ہیں۔ یہ بڑا شبہ شیطان کے مقصدی نہیں ہے بلکہ خدا کے منصوبہ کو برسرے کار ہونے کی بدوجہ۔

## مدعو نہ کہ حرلیف

منگلمری واٹ کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے اسلام کیا ہے (What is Islam) ڈھائی سو صفحات کی اس کتاب میں انگریز مصنف نے اسلام کا نظریاتی اور تاریخی جائزہ دیا ہے۔ آخر میں وہ کتاب کو ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کتاب مغربی لوگوں کو اس قابل بنائے گی کہ وہ اس زندہ اور طاقت ور قوم کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں جو کہ ان کی شریک بھی ہے اور ان کی حرلیف بھی :

This book will enable occidentals to understand better this living and powerful community which is both their partner and their rival.

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان کی تصویر آج دوسری قوموں کی نظر میں کیا ہے۔ یہ تصویر محض قومی سبب نہ کہ نظریاتی۔ دوسری قومیں ہم کو ایسے اس نظر سے دیکھتی ہیں نہ کہ انسان دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ہیں اور اس اعتبار سے وہ زمین کے دوسرے باسیوں کے لئے قومی شریک اور ماوی حرلیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہر قوم کو دوسرے لوگ اسی خاص حیثیت سے جانتے ہیں جس حیثیت سے اس نے اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں متعارف کیا ہو۔ ہر قوم اپنی تصویر آپ جاتی ہے۔ جاپان کو لوگ ایک ٹیکنیکل معاشرہ سمجھتے ہیں۔ چین کو ایک جبری معاشرہ اور برطانیہ کو ایک جہوری معاشرہ۔ ان قوموں کے بارے میں لوگوں کی یہ رائیں خود ان قوموں کے حوالے سے بنی ہیں نہ کہ دوسروں کی اپنی خیال آرائی سے۔ یہی معاملہ مسلمانوں کا بھی ہے۔ مغرب کے لوگ انگریزوں کو محض ایک جغرافی شریک یا ماوی حرلیف کی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو اس کی ذمہ داری خود ہمارے اوپر ہے نہ کہ دوسروں کے اوپر۔ ہم نے اسی روپ میں ان کی نظر میں اپنا تعارف کرنا ہے پھر وہ اس کے علاوہ کسی اور روپ میں ہم کو کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کی یہ تصویر اس کے لئے ازالہ حیثیت یعنی کے جو معنی ہے مسلمان دنیا میں خدا کے دین کے نام لکھ رہے ہیں۔ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ اس رشتہ کو اگر قومیت اور رقابت کا رشتہ بنا دیا جائے تو یہ دوسری قوموں کے لئے سب سے بڑا المیہ ہوگا اور مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا جرم۔

## دعوتی تدبیر

ومن احسن قولاً ممن دعا الى الله وعمل صالحاً وقال انى من المسلمين۔ ولا تستوى الحسنة ولا السيئة ادفع بالتي هي احسن فاذا الذي بينك وبينه عداوة كفره او وحيم۔ وما بلبت له الا الذين صبروا وما يفتاها الا ذو حظ عظيم۔ واما ينرشك من الشيطان نزغ فاستعد بالله ان تدوموا تسمع العليم

اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں۔ تم جو اب میں دو کہو جو اس سے بہتر ہو تو تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قربت والا۔ اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑے نصیبر والا ہے۔ اور اگر شیطان تمہارے دل میں کچھ وسوسہ ڈالے تو اس کی پناہ مانگو۔ بیشک وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

(پہ: ۳۳ - ۳۶)

عبدالرحمن بن عباس نے اس آیت میں الحسنة سے قول توحید مادیا ہے۔ انھوں نے کہا: الحسنة لا اله الا الله والسيئة اشركت اي مع الله شرك من جنس د۔ اس تفسیر کی روشنی میں آیت کی تشریح کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سب سے بہتر تحریک وہ ہے جو دعوت الی اللہ کی بنیاد پر اٹھے۔ اگر کوئی شخص اپنے باطل مذہب و منات کی بنا پر تم سے دشمنی کرنے لگے تو اس کو تو اپنا دشمن نہ سمجھ لو۔ تمہارے اور اس کے درمیان کبھی بھی ایک قربت ہے، اور وہ کیساں فطرت کی قربت ہے۔ اس کی باطنی روش کو نظر انداز کرتے ہوئے تم اس کے سامنے اپنی دعوت حق پیش کرنے رہو۔ اس کے بعد عین ممکن ہے کہ اس کا ظاہر ہی پر دوڑ بٹ جائے اور وہ تمہارے عقیدہ کو اپنا کرتا، قریبی دوست بن جائے۔ مگر یاد رکھو، دشمن کو دوست بنانے کی اس تدبیر کو زیر عمل لانے کی ایک لازمی شرط ہے، اور وہ صبر ہے۔ فریق ثنائی کی اشتعال انگریزی سے تدریجاً الفاظ جنابت عداوتوں تو اس کو شیطان کی کارفرمائی سمجھو اور قول احسن کے رویہ پر صبر جمالی میں قائم رہو۔ یہ بلا تشدد اعلیٰ حوصلہ کی بات ہے مگر ایسے دنیا میں بڑے ہونے والے لوگ ہی بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

## ایک اقتباس

سعودی عرب کے مشہور اخبار المسلمون میں ایک بڑے سعودی عالم کے حوالے سے ایک سوال و جواب چھپا ہے۔ یہ سوال و جواب اور اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

عن أسامة بن جندب عن أنس بن مالك قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وآله يقول: "إن الله يحب المؤمن الذي لا يفتخر بما آتاه الله من فضله".  
 - هذا من كلامه الشيطان. الذين يقولون إن الله لا يفتخر بما آتاه الله من فضله. بل لقد آتاهم الشيطان أفقلا ويريدون أن يؤمن بها الناس. وعموما لا يوجد شيء اسمه ثورة السلافة إلا إذا كان هناك دسيسة كثرية شرعية. الإسلام تصححه وليس انقلاب المسلمون وحدة. - ۲۸ ابریل ۱۹۹۵ء

### ترجمہ

س : حاکم وقت کے خلاف خروج کے سلسلہ میں اہل سنت یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی نقصان برپا کیے بغیر تبدیلی لانے کی قدرت کا پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن آج کل ایک فریق کا خیال ہے کہ یہ بے بنی کا فریق ہے اور موجودہ زمانہ کے لائق نہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔

ج : یہ ایک شیطانانہ بات ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تبدیلی کے لیے اس کی قدرت کی شرط نہیں ہے وہ خود نہ صرف بے ہمت ہیں، بلکہ شیطان نے ان کے ذہنوں میں کچھ باتیں ڈال دی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ لوگ بھی ان پر ایمان سے آئیں۔ دنیا میں ایسی کسی چیز کا مطلق وجود نہیں جس کا نام اسلامی انقلاب ہو، البتہ کہ یہاں کوئی ایسی چیز پائی جائے جو "شرعی کبیرے" کے نام سے موسوم ہو۔ اسلام نصیحت ہے نہ کہ کوئی انقلاب۔

"اسلام نصیحت ہے نہ کہ انقلاب" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام انقلاب نہیں ہے، وہ صرف نصیحت ہی نصیحت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی عمل کا آغاز نصیحت و تلقین سے ہوتا ہے نہ کہ انقلابی اکیورٹیکچر سے نصیحت کے ذریعہ پہلے افراد کے ذہن کو بدل لانا ہے۔ ان کے اندر آمادگی پیدا کی جاتی ہے۔ جب یہ کام بڑے پیمانے پر ہو چکا ہو، اس کے بعد فطری طور پر وہ وقت آجاتا ہے کہ وہ اجتماعی نتیجہ رونما ہو جس کو انقلاب کہا جاتا ہے۔





مولانا مودودی کے اولین ساتھی

سعید ملک (مجموعہ)

کے عمر بھر کے مطالعے کا حاصل

# اسلام، مسلمان اور دورِ حاضر

- فکر و عمل کی حیثیت سے اسلام کا ایک مجموعی تصور
- تاریخ کے پس منظر میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا تجزیہ
- مسلم و غیر مسلم محققین کے نتائجِ فکر سے عصری اسلوب میں استدلال

یہ تصنیف اپنے موضوع پر حوالے  
کی کتاب کا درجہ رکھتی ہے

خوب صورت جلد ○ صفحات: ۹۴۰ ○ قیمت: ۳۳۰

رحمن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ  
اردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۳۱۱۱۹

دَارُ التَّدْوِیْرِ

